بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم اور ارادہ

مولانا عقیل الغروی مدظلہ العالیٰ

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ بمطابق ۲۰۰۴ء

امام بارگاہ شاہِ شہیداں، عامل کالونی، کراچی
(رہائش گاہ علی متقّی جعفری مرحوم)

ترتیب وتزئین

اے ایچ رضوی

ناشر

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk

نام کتاب : .... علم اور ارادہ

مقرّر : .... علامہ عقیل الغروی مدظلہ العالیٰ

تاریخ اشاعت : .... مارچ ۲۰۰۵

تحریر و تصحیح : .... فیضیاب علی رضوی

ترتیب و تزئین : .... اے ایچ رضوی

سرورق : .... رضا گرافکس، ۰۳۳۳-۳۲۰۶۵۴۱

کمپیوٹر کمپوزنگ : .... احمد گرافکس، کراچی، ۶۸۰۱۷۲۱

تعداد : ۱۰۰۰

ناشر : .... محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ، کراچی

قیمت مجلد : .... -/۱۲۵ روپے

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk

تذّکُر و تشکُّر

’’علم اور ارادہ‘‘ کے موضوع پر پیش خدمت مکتوبی نوعیت حضرت علامہ عقیل الغروی کی محرم ۱۴۲۵ھ کے عشرۂ اوّل کی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ عشرہ حسبِ روایت محفل شاہ شہیداں کراچی یعنی بر مکان سیّد علی متقی جعفری اعلیٰ اللہ مقامہ منعقد ہوا تھا۔

سنجیدہ اور فہمیدہ مجلسی حلقے میں اِس عشرے کی قبولیت و جاذبیت کے باعث ہم اِسے کتابی حوالے سے مزید استفادے کے لئے پیش کررہے ہیں۔

تقریر کو تحریر کے زاویئے سے دیکھ کر بھی قاری کو اندازہ ہوجائے گا کہ علامہ کے بیان کی نفاست اور لطافت اُن کے تسلسل فکر کو کہیں گُنجلک نہیں ہونے دیتی ہے۔ وہ بڑی صراحت اور وضاحت سے اپنی فکری کاوش کو بہ آسانی سامع کے ذہن تک پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ رسائی کے اِس تخصص کا سبب دراصل علم الکلام ہے۔ وہ علم الکلام کی اساس پر اپنے دقیق مقدمات سے بھی بہ سہولت نتائج برآمد کرلیتے ہیں۔

محفوظ بک ایجنسی پاکستان میں پہلی بار اس پیش کش کو اپنے لئے ایک سعادت سمجھتی ہے۔ اس سعادت کے حصول کے سلسلے میں ادارہ حضرت علامہ عقیل الغروی اور جناب سیّد نجم الحسن جعفری کا انتہائی شکر گزار ہے۔

سید عنایت حسین رضوی

اِمام بارگاہِ شاہِ شہیداں اور جسٹس سیّد علی متقّی جعفری مرحوم

جناب سیّد علی متقّی جعفری مرحوم ۱۸۸۹ء میں بھرت پور اسٹیٹ کے پہرسر قصبے میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور الہ آباد یونیورسٹیز سے گریجویشن میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اُردو، فارسی، عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تعلیمی میدان میں اُن کی پہچان شعبۂ قانون (Judiciary) سے وابستہ تھی۔ تقسیم ہند سے قبل یوپی اور سی پی کے مختلف اضلاع میں منصف اور جج کے عہدوں پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے وقت بستَر اسٹیٹ میں وزیر قانون کے منصب پر فائز تھے۔

۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سندھ میں اور ۱۹۵۰ء سے عامل کالونی کراچی میں مقیم رہے۔

مجالسِ عزا سے اُنہیں قدرتی مناسبت اور قلبی لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنے وطن پہرسر میں ۱۹۰۹ء میں مجلسِ شام غریباں کی بنیاد رکھی اور خود ہی اس مجلس سے خطاب کیا۔ کراچی میں اُن کے قائم کردہ عشرۂ مجالس کی ایک خاص اہمیت ہے۔

یہ مقام شکر ہے کہ اُن کے فرزند جناب سیّد نجم الحسن جعفری صاحب نے اس سلسلے کو بہترین طریقے سے سنبھالا ہے اور اب تک اُسی پُر فروغ انداز میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس منبر پر علامہ حافظ کفایت حسین، حافظ ذوالفقار علی شاہ، مولانا سیّد اظہر حسن زیدی، مولانا سیّد محمد رضی مجتہد، مولانا مصطفیٰ جوہر، علامہ آیت اللہ سیّد العلماء مولانا سیّد علی نقی نقوی جیسے جید علماء اور خطباء عشرہ ھائے مجالس سے خطاب کرتے آئے ہیں۔

گزشتہ کئی برسوں سے اسی منبر پر برصغیر کے معروف اور جواں سال فقیہہ اور فلسفی علامہ سیّد عقیل الغروی خطاب فرما رہے ہیں۔ پیش نظر پیش کش اُن کے ۱۴۲۵ھ کے عشرۂ مجالس کے بیانات پر مشتمل ہے۔

رَبَّنا تَقَبَّلْ مِنّا اِنَّکَ اَنتَ السمیع العلیم۔

اے۔ ایچ۔ رضوی

سیّد علی متقی جعفری مرحوم

بانی امام بارگاہ شاہِ شہیداں عامل کالونی کراچی۔

(التماس سورۂ فاتحہ)

اے محرّم! تیری فضا کو سلام

سلام از نصیؔر ترابی

یہ جو مجلس میں اشکباری ہے
یہاں خرچے میں نفع جاری ہے

اے محرّم! تیری فضا کو سلام
دن ہمارا ہے، شب ہماری ہے

یہ مگر ذکرِ کربلا سے کُھلا
ایک غم میں بھی غم گساری ہے

حلقۂ شورِ العطش میں کہاں
وہ جو دریا کو بے قراری ہے

کون پانی کو روکنے والا
پیاس کا صبر اختیاری ہے

ہمہ شب انتظارِ صبحِ وصال
شب نہیں، زندگی گزاری ہے

فیصلے کا ہے ایک پل، ورنہ
سوچنے کو تو عمر ساری ہے

دو قدم رہ گیا ہے خیمۂ شاہ
حُر پہ یہ وقت کتنا بھاری ہے

آ گئی یہ بھی منزلِ حجّت
اب فقط بے زباں کی باری ہے

اب بھی ہے شانۂ علم پر بُلند
مَشک غازی نے کب اتاری ہے

(یہ سلام نویں محرم کی مجلس میں پڑھا گیا)

پیغام آشنا خطیب علامہ سیّد عقیل الغروی کے علمی آثار

از آل محمد رزمی

یہ بات لکھتے ہوئے میں خائف ہوں کہ کہیں کوئی مجھ سے ''خطیب'' کی تعریف نہ پوچھ لے۔ جس طرح انسان کی تعریف، حُسن کی تعریف، شاعری کی تعریف اور زندگی کی تعریف جامع اور مطلق طور پر ممکن نہیں اسی طرح ''خطیب'' کی بھی کوئی مطلق اور جامع تعریف نہیں ہے۔ اگر لغوی معنیٰ پر اکتفا یا بھروسہ کیا جائے تو خطبہ پڑھنے والا، وعظ سنانے والا، لیکچر دینے والا اور مقرّر کے ہیں مگر ''خطیب'' کی یہ تعریف ناکافی ہے۔ اہلِ فکر و نظر لفظ ''خطیب'' کی جامعیت اور ان کے دائرہ کار کی وسعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

خطیب اپنے ماحول کا عکاس، اپنی قوم کا صورت گر، اپنے افکار کا شارح، اپنے نظریات کا مبلغ اور اپنے عقائد کا پیغام رساں ہوتا ہے۔ یہاں میں جس خطیب کے تقریری مجموعہ پر تبصرہ کر رہا ہوں وہ ''خطیبِ منبرِ سلونی'' کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور جس کے نام کی نسبت اس شہر سے ہے جہاں خطیبِ منبرِ سلونی محوِ آرام ہیں۔ میری مراد حجتہ الاسلام والمسلمین علامہ سیّد عقیل الغروی سے ہے جو جہانِ خطابت کے مسافر جلیل بھی ہیں اور علوم محمدؐ وآل محمدؐ کے معتبر مبلغ و وکیل بھی ہیں۔

گزشتہ دو دہائی سے علامہ سیّد عقیل الغروی کی خطابت کی گونج پوری دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ وہ پوری سنجیدگی، پوری یکسوئی، پورے خلوص اور پوری دل سوزی کے ساتھ بزرگوں کو اپنا سبق اور نئی نسل کو تعلیمات محمدؐ وآل محمدؐ سے بہرہ مند اور اسلامی آداب وشعائر سے آشنا کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب علامہ سیّد عقیل الغروی کے مجموعہ تقریر ''علم اور ارادہ'' کی کتابی صورت

ہے۔ تقریر کو تحریر کے قالب میں ڈھالنے کا کام پاکستان کے معروف اشاعتی ادارے محفوظ بک ایجنسی کے روحِ رواں جناب سیّد عنایت حسین رضوی نے بڑی ذمہ داری و جگر کاوی کے ساتھ کیا ہے جو ان کی علم دوستی اور مذہبی ارتباط کی آئینہ دار ہے۔ ایک عام قاری کے لیے علامہ موصوف کی تقریر کو سمجھنا قدرے دشوار ضرور ہے لیکن دل میں اتر جانے والی کیفیت کے ساتھ اثر انگیز ہے۔

جس طرح رہن سہن، وضع قطع، معیارات واقدار اور طرزِ زندگی بدل گئی اسی طرح خطابت کے حوالے سے ساعتیں، بدل گئیں، موضوعات بدل گئے، انداز بدل گئے، ذوق بدل گیا یہاں تک کہ اسلوب بھی بدل گیا ہے۔ ہر خطیب کا اپنا ایک Style ہے۔ کل تک خطابت ''کربل کتھا'' اور ''شہادت نامہ'' کے بیان تک محدود تھی۔ مقفیٰ و مسجّیٰ خطابت کا دور بھی قصہ پارنیہ بن گیا۔ پُر جوش اور بالحن خطابت بھی اب معیار نہیں رہی۔

اب خطابت میں انداز کے ساتھ ساتھ مقصد کو بھی پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ ورنہ ہماری سب سے بڑی درسگاہ عزاداری سید الشہداءؑ غیر مؤثر ہو کر رہ جائے گی۔ اگر ہم نے منبر پر بے پڑھے لکھے اور بے عمل لوگوں کو بٹھایا اور دین فروشوں کو رہنما اور بے خبروں کو علماء کی صف میں کھڑا کیا تو ہمارا اللہ حافظ ہے۔ ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم ہدایتِ انسانی کی سب سے بڑی درسگاہ اور عظیم ترین University کربلا سے وابستہ ہیں۔ لیکن کیا ہمارے علم و فہم و کردار و عمل اور ہماری اس وابستگی کے اعلان میں کوئی یگانگت ہے؟ اگر ہے تو بے شک ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اس وابستگی کا اظہار کریں۔ اگر نہیں تو ہم دنیا کو اور خود کو دھوکہ دے رہے ہیں اور کربلا والوں کی عظمت کو بھی گھٹا رہے ہیں۔ ہمیں اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لینا چاہیے ہم کہیں دانستگی یا نادانستگی میں خدا اور رسولؐ کے مجرم تو نہیں بن رہے؟ اور ہم امام حسین علیہ السلام اور ان کے مقاصد کے مخالف سمت تو سفر نہیں کر رہے ہیں؟

اس جُرم میں ہم یعنی سامعین، بانیانِ مجلس اور خطیب برابر کے شریک ہیں۔ ہماری مجلس کا فلسفہ محض رُونے رُلانے، نعرہ حیدری، سمعی تعیش اور ذہنی ریاضت تک محدود نہیں۔ اس

کے پیچھے ایک قوت متحرکہ اور ایک عظیم مقصد ہے۔ یہ تبلیغ دین کے لیے نہایت مؤثر وموقر ذریعہ اور فیض رساں ادارہ ہے۔ دنیا کی کسی قوم کے پاس نشر و اشاعت کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے۔

بقول امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ ان آنسوؤں نے ۱۴سو سال تک ہماری حفاظت کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے علماء وخطباء کا کردار بڑا قابل تعریف رہا ہے جنہوں نے اندرونی وبیرونی دونوں محاذوں پر ہماری رہنمائی کی ہے۔ اندرونی محاذ پر تفسیر قرآن، نہج البلاغہ، اقوال معصومینؑ، سیرت محمدؐ وآل محمدؐ، احادیث، علمی مسائل، فقہی مسائل، اصول و فروع دین کی وضاحت وتشریح فرمائی اور بیرونی محاذ پر دشمنوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کو ادلہ شرعیہ وبراہین عقلیہ کے ہتھیاروں سے روکا۔

حجۃ الاسلام علامہ سیّد عقیل الغروی مدظلہ العالی قابل قدر ولائقِ ستائش ہیں کہ وہ اپنی خطیبانہ ذمہ داریوں سے کماحقہ آگاہ ہیں اور خطابت کے رموز وعلائم کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ وہ سامعین ومومنین کو دین کی صحیح فکر سے روشناس کراتے ہیں اور تاریخی حقائق کو بلاکم وکاست بیان کرتے ہیں اور امکانی حد تک روایات کی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور ایسے موضوعات ومضامین کا انتخاب کرتے ہیں جس سے ہمارے اعمال متاثر ہوتے ہیں۔

ہم علامہ کی تقریر کے کچھ اقتباسات نذر قارئین کررہے ہیں جس سے ان کی وسیع النظری اور قادر البیانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

☆ میرے کانوں میں گونج رہا ہے محرم کا چاند طلوع ہوگیا۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اپنے اندر کتنا بڑا پیغام رکھتا ہے۔ کیسی تعبیر رکھتا ہے۔ جس کو سننے کے بعد دل میں کیسی جلا پیدا ہوتی ہے، کیسی قوت پیدا ہوتی ہے۔ ظلم اور باطل کے خلاف استقامت کی، ثبات کی، صبر کی کیسی توانائی مل جاتی ہے۔

☆ حُر کے بارے میں فرماتے ہیں ''شبِ عاشور سے قبل وہ عقلِ خام کار کا نمائندہ تھا، صبح کو وہ عقلِ مجسّم بنا ہوا تھا۔ یہ تزکیۂ نفوس اور تکمیلِ عقول اور تطہیر شعور کی تربیت گاہ ہے''

☆ ناقص افراد کے اندر اظہارِ علم کی بیتابی ہوتی ہے۔ یہ اظہار علم کی بیتابی نہیں، اضطراب جہل ہے۔

☆ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے راز کو کاش کوئی سمجھ جائے...... اشیا کے اتنے نام ہیں کہ اس کا احصا نہیں ہوسکتا۔ ہر ذرہ کا الگ نام رکھ لیجئے تو بجا لیکن جب یہ پوری کائنات سمٹ کر ظرفِ ذہن میں آجاتی ہے تو اس کا صرف ایک نام ہوتا ہے اور وہ علم ہے۔

☆ کوئی علمی مسئلہ ہو، کوئی فکری مسئلہ ہو، کوئی اعتقادی مسئلہ ہو، کوئی دینی مسئلہ ہو زندگی کا کوئی علمی مسئلہ ہو اسے یونہی انجام نہ دیجیئے۔ تساہل پسندی کو کہیں دخل نہیں۔

☆ حضرت محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تخلیق کا نام علیؑ ہے، زہراؑ ہے، حسنؑ ہے، حسینؑ ہے۔ علیؑ کی تصنیف کا نام سلمانؓ ہے، بوذرؓ ہے، میثمؓ ہے۔ حسینؑ کی تصنیف کا نام حبیبؓ ابن مظاہر ہے۔

☆ مشرق میں کون سا شر ہے جو مغرب میں نہیں اور مغرب میں کون سا خیر ہے جو مشرق میں نہیں۔ خیر و شر جغرافیائی حدود میں منقسم نہیں ہیں۔ ہر قسم کے تعصّبات سے بلند ہوجائیں، نہ سمتوں کا تعصّب ہو، نہ نسلوں کا، نہ ملکوں کا تعصب، نہ زبان کا۔ تب آپ انسان کہلانے کے مستحق ہوں گے اور جب اس سے بلند ہوں گے تو مسلمان کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

صفحات کی محدودیت اور اختصار کی قدغن کے پیش نظر یہاں ہم مزید بحث واکتشاف سے گریز کرتے ہوئے علامہ سیّد عقیل الغروی کی خطابت کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔
علامہ سیّد عقیل الغروی کی خطابت کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں یوں کہی جاسکتی ہیں۔

☆ ان کی خطابت میں موضوع کی انفرادیت معنویت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

☆ ان کے بیان میں عقیدہ و عمل کا توازن برقرار ہے۔ جس کے باعث ایک کو دوسرے پر قربان ہونے کی ضرورت نہیں۔

☆ ان کی تقاریر میں شعوری عنصر پوری ضرورت و پورے محاسن کے ساتھ موجود ہے۔

☆ ان کی مجلس میں فکر اپنی پوری توانائی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔
☆ ان کے یہاں نظریات اپنے پورے قد کے ساتھ موجود ہیں۔
☆ وہ اپنے وعظ میں سامع سے زیادہ خوشنودی محمدؐ وآل محمد علیہم السلام کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

☆ ان کے ملفوظات میں تفسیر وحدیث، تاریخ وسیر، فلسفہ و منطق، علم کلام ومعنی وبیان، فقہ واصول، معقولات ومنقولات، پورے مصادر وماخذ اور پوری روح کے ساتھ موجود ہیں۔

☆ ان کے یہاں زبان وبیاں، سلاست، وبلاغت پرکاری وروانی، ذکاوت وذہانت اپنے معراج پر ہے، اردووعربی ادب پر ان کی نگاہ بڑی دقیع وگہری ہے۔ وہ خطابت میں لفظوں کو برتنے کے آداب جانتے ہیں اور اس کا پورا Advantage لیتے ہیں۔ لفظوں کے حسن سے ذہن کے بیکراں بحر میں فکر کی کشتیاں چلنے لگتی ہیں۔ یہ ان کے خطابت کے فن کا جادو ہے کہ ہر سننے والا ان کی مجلس سے مسحور آتا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک فسوں سا طاری ہوجاتا ہے جو زندگی کے موسموں کو بدل دیتا ہے اور آنسوؤں کی پُر ندامت پت جھڑ اس کے گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ وہ ضمیر کی دہلیز پر رُک کر اپنے اعمال پر شرمندہ ہوکر اپنے رب سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔

ذات واجب سرکار علامہ کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ عصر حاضر میں ارادہ وعلم کی ضرورت مسلم ہے۔ یہ کتاب علماء وخطباء، محققین و دانش وروں، طلبہ وابلاغ سے وابستہ افراد کے لیے ایک نادر تحفہ ہے جسے پیش کرنے کا سہرا محترم سیّد عنایت حسین رضوی کے سر ہے۔

سرنامۂ کلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورۂ روم آیت ۳۰)

تو (اے رسولؐ!) تم باطل سے کترا کے اپنا رُخ دین
کی طرف کیئے رہو یہی اللہ کی بناوٹ ہے
جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی (درست کی ہوئی)
بناوٹ میں (تغیّر) تبدُّل نہیں ہوسکتا یہی مضبوط (اور بالکل سیدھا)
دین ہے مگر بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(ترجمہ از مولانا فرمان علیؒ)

مجلس ۳۰ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ ۙ﴿۱﴾

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ

(سورۃ الملک آیت نمبر ۱ تا ۲)

برادران عزیز! ....محرم کا چاند نمودار ہو چکا۔ بس یہ ایک فقرہ جب سے نماز مغرب تمام ہوئی ہے، میرے کانوں میں گونج رہا ہے کہ محرم کا چاند طلوع ہو گیا۔

ایک چھوٹا سا فقرہ اپنے اندر کتنا بڑا پیغام رکھتا ہے۔ کیسی تعبیر رکھتا ہے، جس کو سننے کے بعد دل میں کیسی جلاء پیدا ہوتی ہے، کیسی قوت پیدا ہوتی ہے۔ ظلم اور باطل کے خلاف استقامت کی، ثبات کی، صبر کی کیسی توانائی مل جاتی ہے۔

آنکھوں کا کام ہے اشک افشانی، آنکھیں آنسو برساتی ہیں لیکن اس ذکر میں جو قوت و توانائی ہے وہ اپنی جگہ۔ محل نہیں ہے اس لفظ کے استعمال کرنے کا لیکن استعمال کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ الفاظ اپنے معانی اور مفاہیم میں بہت زیادہ اضافیت اور نسبیّت رکھتے ہیں۔ الفاظ اپنے مَحَلِ استعمال کے اعتبار سے، اپنے نحوِ استعمال کے اعتبار سے،

الفاظ کو کس سیاق وسباق میں استعمال کیا جارہا ہے وہ زمین تا آسمان تفاوت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اگر صرف غم و الم ومصائب و المنا کی کا پہلو سامنے ہو تو یہ کلمہ اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن میں عرض کررہا ہوں کہ قابل مبارکباد ہے وہ ملت کہ جو ایک سال اسی ذکر کے ساتھ تمام کرتی ہے اوران کا دوسرا نیا سال اسی ذکر کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔

اس ذکر کے سائے میں جو زندگیاں گزر رہی ہیں ان زندگیوں کی سعادتِ ابدی کی ذمہ دار وہ ہستیاں ہیں کہ جن کا یہ ذکر ہے۔ سعادتیں آپ کے قدم چوم رہی ہیں۔ آپ قابل مبارکباد ہیں۔

آج کی یہ مجلس آپ کے علم میں ہے کہ ایصال ثواب کے عنوان سے ہوتی ہے۔ اس عزا خانے کے بانی مرحوم سید علی متقی جعفری ابن سید احفاد علی جعفری کے ایصال ثواب کے لئے ہوتی ہے۔

آپ دیکھئے حیات وموت کا تصور ہمارے یہاں کیا ہے اور جب اس ذکر سے کوئی جُڑ جاتا ہے تو اس کا نام بھی کیسا لازوال ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیتیں جو اس وقت تبرکاً آپ کے سامنے میں نے تلاوت کیں۔ سورۂ مبارکۂ مُلک کا مطلع ہے۔ مطلعِ سخنِ الٰہی۔ اور کلامِ الٰہی جس کے متعلق میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ ہر ہر کلمہ اس کا بیک وقت، بیک آن، جمال وجلال کا ایسا مجموعہ ہے کہ اس میں جمال بھی بے انتہا ہے اور جلال بھی بے پناہ۔

تبارک الذی بیدہ الملک بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام چیزوں کا اختیار ہے۔ تبارک الذی بیدہ الملک۔ اب آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے کس کلمہ کا ترجمہ اختیار سے کرلیا۔ ''ید'' کا ترجمہ تو، بہت آسان ہے۔ دستِ قدرت۔ لیکن یہ اختیار کا ترجمہ کہاں سے آ گیا؟

ظاہر ہے کہ وقت آج کی حد تک کم ہونے کی بناء پر استدلال کی تمام کڑیاں حذف کرتے ہوئے اور آپ کی ذہانت پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ یعنی اس ذہانت پر بھروسہ

کرتے ہوئے کہ جو زیرِ سایۂ منبر پروان چڑھتی ہے۔ وہ ذہانت ہی کچھ اور ہوتی ہے، وہ فراست ہی کچھ اور ہوتی ہے، وہ فطانت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دنیا بھر کی عقلیں قربان کردی جائیں اس ایک شعور پر جو زیرِ سایہ منبر پروان چڑھتا ہے۔ اس شعور پر اور اس ذہانت پر بھروسہ کرتے ہوئے میں گفتگو کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

عام طور پر موت جبر کا حوالہ بن کر سامنے آتی ہے۔ عام طور پر موت: جبر کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ یہی قران ہے کہ جس نے اس موت کو طلب و اختیار قدرت کا سب سے بڑا انگیزہ بنا دیا ہے۔ اگرچہ یہ پہلو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ موت جبرِ مشیّت کا نام نہیں ہے، لطفِ الٰہی کا نام ہے، جس طرح زندگی لطفِ الٰہی ہے اسی طرح موت بھی لطفِ الٰہی ہے۔

وہ جملہ جو میں نے شروع میں استعمال کیا کہ الفاظ کی نِسبیّت پر نظر رہے یعنی الفاظ و معانی کی relativity پر نظر رہے آپ کی۔ الفاظ جوں کے توں ہوتے ہیں لیکن معانی کی نسبتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اور نحوۂ استعمال بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایک بات عرض کر رہا ہوں کہ جس طریقے سے قران مجید کے آیات و کلمات میں جلال الٰہی بھی ہے اور جمال الٰہی بھی ہے اسی طریقہ سے زندگی کے جتنے مظاہر ہیں، ہر ہر شانِ حیات، ہر ہر ادائے زندگی میں کہ جو اس کی عطا کردہ عطائیں ہیں، اس کی سکھائی ہوئی ادائیں ہیں، اس کے عطا کردہ شئون ہیں۔ زندگی کو اس نے خلق فرمایا ہے۔

جتنے بھی مظاہرِ حیات ہیں سب میں جلال کا رخ بھی موجود ہے جمال کا رخ بھی موجود ہے۔ ہاں کہیں کہیں زاویۂ نظر کی بات ہوتی ہے کہ کس کی نظر میں کون سا پہلو آجائے۔ ورنہ جلال و جمال ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور اگر اس اصطلاح میں، وہ اذہان خاص طور پر کہ جو ذکرِ خدا اور ذکرِ اولیائے خدا کے سائے میں ایک خاص معنویت پیدا کرتے ہیں، ان اذہان کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ اگر اسمائے الٰہیّہ میں مسلسل غور کرتے رہیں آپ، مسلسل ان کے معانی کو درک و دریافت کرتے رہیں اپنے

دامنِ حیات میں، صرف صفحۂ کاغذ پر نہیں۔ ڈکشنری کے اوراق الٹ کر نہ دیکھیں کہ جلال کے معنی کیا ہیں، جمال کے معنی کیا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے جو ۹۹ نام ہیں ان کے معانی ڈکشنری میں تلاش نہ کریں۔ بلکہ اِس قاموس حیات میں تلاش کریں۔ یہ زندہ قاموس یعنی آپ کی ذات۔ یہ وجود انسانی، یہ حیاتِ انسانی۔

اور پھر حیات انسانی سے وابستہ اور اس کے گرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات کہ جو اصلی قاموس ہے، یہ جو زندہ لغت ہے، اس میں اگر معانی کو درک و دریافت کریں تو پھر سفر روحی اور سفرِ علمی اور سفرِ معنوی تیز رفتار ہوجاتا ہے، دنیا کہیں پیچھے رہ جاتی ہے اور مومن کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

تو عزیزان گرامی! میرے ذہن پر یہ کیفیت طاری رہتی ہے، دل پر یہ مضامین طاری رہتے ہیں تو یہ باتیں بار بار زبان پر بھی آتی ہیں کہ اگر جلال و جمال الٰہی اور جلال و جمالِ اسمائے الٰہی پر نظر ہے اس کو ذہن وقلب درک و دریافت کررہے ہیں اور قران مجید کے لہجے سے مانوس ہیں آپ۔ اور آپ مانوس نہ ہوں گے تو کون مانوس ہوگا۔ دنیا میں کسی دوسرے شخص کو آپ کے اوپر سبقت کا موقع نہیں ملنا چاہیئے اس لئے کہ مکتبِ قران آپ ہی کا مکتب ہے۔ آپ کے منبروں سے جس قدر قران کی تفسیر بیان ہوتی ہے، تاویل بیان ہوتی ہے وہ کہیں اور بیان نہیں ہوتی۔

تو اگر ذہن عالی میں وہ مضامین ہیں تو عرض کروں کہ صفاتِ الٰہیّہ کے باب میں جلال و جمال کی اصطلاح آتی کہاں پر ہے؟........ جلال و جمال کی اصطلاح وہاں پر آتی ہے کہ جسے دینیات کی عام کتابوں میں کہتے ہیں کہ یہ صفاتِ ثبوتیہ ہیں یہ صفاتِ سلبیہ ہیں۔

وہ صفتیں جو ذاتِ خدا میں پائی جاتی ہیں وہ ثبوتیہ ہیں جو نہیں پائی جاتیں وہ سلبیہ ہیں۔ اسی کو عرفان کی زبان میں، عرفان کی ڈکشنری میں، علمِ عرفانِ نظری میں جو صفاتِ ثبوتیہ ہیں انہیں صفاتِ جمالیہ کہتے ہیں جو صفاتِ سلبیہ ہیں انہیں صفاتِ جلالیہ کہتے ہیں۔ یہ تو مقدماتی

بحث ہے کسی بھی کتاب میں مل جائے گی۔ اسے مربوط کر رہا ہوں اس بحث سے کہ جو میرے ذہن میں ہے اور اسے منتقل کرنے کا وقت بھی اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔

دیکھئے عالمِ مجرّد، عالمِ ماورائے طبیعت، عالمِ مافوقِ طبیعت.........

(یہ نہ سمجھئے گا کہ چند موٹی موٹی اصطلاحیں آپ کے سامنے دہرا کر آگے بڑھ جاؤں گا)۔

عام طور پر جسے metaphysics کہتے ہیں، اس کا ترجمہ مابعد الطبیعات درست نہیں ہے۔ یہ تو ایک عاجزانہ ترجمہ ہے، عاجزانہ تعبیر کا۔

Aristotle (ارسطو) نے اس کائناتِ مادی پر خوب تحقیق کی اور فزکس پر بہت کچھ لکھا، فزیکل ورلڈ پر لکھا۔ اس کے بعد اس کی ذہانت و فطانت نے محسوس کیا کہ کچھ چیزیں تو ہمیں نظر آ رہی ہیں کچھ چیزیں اور ہیں جن کا ہونا تو ثابت ہے مگر ہماری گرفت میں نہیں آ رہی ہیں۔ اس نے جب ان چیزوں پر گفتگو کی تو کوئی مناسب عنوان سمجھ میں نہ آیا تو فزکس کے بعد جو کچھ لکھا اسے Metaphysics لکھ دیا یعنی فزکس کے بعد۔

تو یہ عاجزانہ عنوان تھا۔ عجز بیان تھا نا؟ کوئی مناسب عنوان ہی نہ ملا کہ اس بحث کا عنوان کیا رکھیں۔ تو کہا بس طبیعیات کے بعد جو کچھ ہے وہ مابعد الطبیعات....... میں کہتا ہوں کہ ایک لفظ بدل دینے سے عنوان موزوں ہو جائے گا۔ ''بعد'' کے کلمہ میں وہ معنویت نہیں ہے جو ''مافوق'' کے کلمہ میں ہے جو چیز مافوق ہوتی ہے وہ ماتحت پر حکمراں ہوتی ہے۔

مابعد اور ماقبل کا اتنا اثر نہیں ہے لیکن مافوق اور ماتحت اگر ہو ذہن میں...........!

اپنی اصطلاح میں بھی سمجھئے۔ جو چیز مافوق ہوگی وہ اپنے ماتحت پر حکمراں ہوگی۔ اسی طرح چونکہ روح بدن سے مافوق ہے اس لئے روح حکمراں ہوتی ہے بدن محکوم۔ تو جو مافوقِ طبیعت عالم ہے۔ اس مادی اور material اور physical world سے اوپر جو عالم ہے جسے عالمِ مفارقات کہتے ہیں، عالمِ مجردات کہتے ہیں، عالمِ عقول کہتے ہیں، عالم بالا کہتے ہیں، عالمِ لاہوت کہتے ہیں۔ اور جس عالمِ بالا کا ایک ترشح ہے آپ کی اور ہماری روح........ سحابِ لطفِ الٰہی کا ایک ترشح ہے روحِ انسانی۔

تو جلال و جمال سے اس بحث کا تعلق کیا ہے؟ جب تک عالمِ مافوق اپنے اثراتِ کو نافذ کرے عالمِ ماتحت میں ایک جمالیات کا عالم سامنے آتا ہے۔ اور جب عالمِ مادی سے عالمِ مافوق دامن کشاں ہو تو ایک جلال کی دنیا سامنے آتی ہے۔

جب عالمِ بالا سے عالمِ مادی پر تجلیات ہوں جب سحاب رحمت کی بارش ہو، جب وہاں سے ترشحات ہوں، تو ایک جمالیات کی دنیا سامنے آتی ہے۔ جمالِ رحمت الٰہی، جمالِ لطفِ الٰہی۔ رزق جمالیات کا حصہ ہے جو ہمارے حصے میں آرہا ہے۔ جو کچھ وہاں سے آرہا ہے وہ سب جمالیات ہے اور جہاں اس عادی دنیا سے بے نیازی کا اظہار ہوگا وہیں شانِ جلالی سامنے آئے گی۔

جہاں لطف، عنایت ہوگی وہاں جمال، جہاں بے نیازی کا اظہار ہوا وہاں جلال۔ اگر ذہن یہاں تک آگیا تو سمجھئے کہ ہماری اور آپ کی موت ہماری روح کے جلال کا مظہر ہے۔

جب تک روحِ انسانی اس جسم سے متعلق رہے اور اپنے صفات اس جسم کے ذریعے سے ظاہر کرتی ہے جمالِ روح ظاہر ہوتا ہے، جلال روح ظاہر نہیں ہوتا اور جب جسم سے بے نیازی کا اظہار ہو تو جلالِ روحِ انسانی سامنے آتا ہے۔

اب آپ سمجھے کہ موت کیا چیز ہے؟........ موت کیا ہے؟........ موت جلالِ روحِ انسانی کا مظہر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تعریف نئی ہو۔ میں کوئی اِدّعا نہیں کرتا لیکن ہے یہی حقیقت۔ روح فنا تو نہیں ہوجاتی، روح نابود تو نہیں ہوجاتی۔ آپ کے سامنے کیا اس کے بارے میں دوبارہ استدلال قائم کرنا ہوگا؟ آپ محتاجِ استدلال ہیں؟....... روح باقی ہے، روح ثابت ہے۔ روح مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ عالم بالا کی طرف مسلسل بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے روح۔ اور اسے بلند ہونا ہی ہے۔

میں منبر سے یہ اصطلاحیں اور یہ ترکیبیں استعمال کرتا ہوں، کیوں زور دیتا ہوں کہ ادبی لحاظ سے الفاظ اور لفظ و معنی کے رشتہ پر غور کریں۔ آپ نے کبھی غور فرمایا، ہمارے ادباء نے، ہمارے شعراء نے، ہمارے بزرگوں نے روح کے لئے استعارہ کیا انتخاب

کیا؟....... کہتے ہیں ”طائرِ لاہوتی“۔ طائر کی پرواز ہمیشہ بلندی کی طرف ہوتی ہے اور طائر قفس میں نہیں رہ سکتا۔ تو یہ روح انسانی ایک محدود وقت کے لئے جسم میں رہے گی مگر یہ ہمیشہ اس قفس جسم میں رہ نہیں سکتی، یہ رہنے کے لئے آئی ہی نہیں ہے۔

جیسے طائر کی پرواز ہمیشہ بلندی کی طرف ہے اسی طرح روح کی پرواز ہمیشہ بلندی کی طرف ہے۔ اور عرض کروں....... دوسری تشبیہ، دوسری تمثیل جو حدیث میں بھی آئی۔ آپ لاکھ جتن کریں....... موت کی ایک بڑی حسین تشبیہ حدیث شریف میں بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسے پھول سے خوشبو نکل جاتی ہے ویسے جسم سے روح نکل جاتی ہے....... کتنی حسین تشبیہ ہے۔

اب آپ سے عرض کروں۔ آپ ایک کھلے ہوئے گلاب کو، وہ گلاب جس کی تخم ریزی اسی زمین پر ہوئی تھی، وہ گلاب جس کا پودا اسی زمین پر اُگا تھا، وہ گلاب جو اسی زمین پر اگے ہوئے پودے کی شاخ سے پھوٹا ہے وہ گلاب جو اسی شاخ پر کھلا ہے اس کی کتنی ہی نگہداشت کریں، کتنا ہی ماحول بنا کر رکھیں کہ وہ تروتازہ رہے مگر خوشبو اس سے جدا ہوتی رہے گی ایک وہ منزل آئے گی کہ خوشبو پرواز کر چکی ہوگی اور وہ گلاب کا پھول بغیر خوشبو کے رہ جائے گا۔ یہی آپ کے جسم کی کیفیت ہے۔ آپ کا جسم یہیں رہ جائے گا، روح پرواز کر جائے گی۔

اس لئے توجہ نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم اس جسمانی ماحول کی نگہداشت کریں، ہماری توجہ یہ ہونی چاہئے کہ روح میں قوت اتنی پیدا ہو جائے کہ اس کی پرواز زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ کہیں درمیان میں ٹھہر کر نہ رہ جائے، کہیں معلق نہ ہو جائے۔

جب مادی دنیا سے علاقہ ٹوٹے تو ہماری روح کا وہ جلال سامنے آئے کہ جسے حقیقت میں جلال کہتے ہیں۔

قران حکیم میں موت وحیات کا تذکرہ بڑے حکیمانہ انداز میں کیا گیا ہے لیکن اب ایک جملہ کہہ کر گفتگو کو مختصر کروں گا....... ایک جملہ یہ ذہن میں محفوظ رکھئے کہ موت اسی

زندگی کی، ہماری حیات کی مختلف حیاتی اداؤں کی طرح ایک ادائے جلال ہے........ اور دوسری بات یہ کہ جو ترجمہ میں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ لفظِ اختیار کہاں سے آ گیا؟ اور میں نے عرض کیا کہ اسی موت کو جو ہمارے عام ذہن کے لئے، ہمارے عام لٹریچر میں، ہماری عمومی فلاسفی میں جو جبر کا اشارہ ہے اس بارے میں ایک عملی بات سنتے چلے جایئے اور اپنے ذہنوں کو پست ہمتی میں مبتلا نہ ہونے دیجئے۔ مومن کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہنا چاہیئے۔ مومن کا سرمایۂ ہمت بڑا قیمتی ہے، اسے حدیث کی لفاظی نہ سمجھنا دوستو!.......

خدارا! میں منبر سے کوئی بات ایسی نہیں کہتا ہوں کہ جس سے خطابت کا حق ادا ہو جائے گا آپ یہ سمجھیں کہ حسنِ کلام ہے، شاعرانہ استعارہ ہے۔ دوسرے منابر ہوں گے ایسے کہ جہاں صرف سخن گسترانہ باتیں ہوتی ہوں۔ یہ منبر حسینی ہے، یہاں سخن گسترانہ، باتیں نہیں ہوتیں۔ یہاں حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور وہی ایک طالب علم کی کوشش ہوتی ہے۔ ہم لاکھ مادی ماحول میں اسیر ہوں، مگر ہماری ہمتیں بلند ہونی چاہئیں۔ ہماری نظر ہمیشہ روح کے ارتقاء پر ہونی چاہئے۔ ہماری نظر ہمیشہ روح کے ارتقائی سفر پر ہونا چاہئے۔ اس لئے یاد رکھئے کہ قرآن مجید نے کس طریقے سے موت کو اختیار کا انگیزہ بنایا۔

خدارا! یہ بات ذہن میں رکھیے۔ ہماری ۹۹ فیصد سے زیادہ اہل دانش بھی موت کو جبر کے استعمارے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور جبر کے ساتھ کیا کیا!........ دیکھئے اس دنیا میں آنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، اس دنیا سے جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ موت کا ایک دن معین ہے........ کس نے کہا کہ موت کا دن معین ہے؟ کہاں ہے قرآن مجید میں کہ موت کا دن معین ہے؟........ کس حدیث میں لکھا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے؟ کیوں موت سے حراساں ہے یہ مسلمان مجمع؟ کیوں موت کا آسیب طاری ہے۔

حضورؐ نے فرمایا: خلقنا للبقاء لا للفناء٥

ہم بقا کے لئے پیدا ہوئے ہیں فنا کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔

آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ اگر یہی بات ذہنوں میں ہے کہ موت کا ایک دن

معین ہے اور موت ایک جبر مشیّت ہے، موت ایک جبر طبیعت ہے تو پھر مخبرِ صادقِ مصدق نے کیوں فرمایا قسم کھا کر، عملی بات عرض کر رہا ہوں۔

''قسم ہے اسی پروردگار کی جس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا، قسم ہے اس پروردگار کی جس کے قبضہ ٔ قدرت میں مصطفیٰ کی جان ہے۔ کہ اگر تم صلہ ٔ رحم کرتے رہو، اگر تم صدقہ دیتے رہو تو تمہاری موت ٹل سکتی ہے۔''

دن معین ہے تو پھر ٹل کیسے جائے گا؟ ایسے ہی معین ہے تو پھر ٹلنے کا کیا مطلب؟ کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

یہ بھی انہی مصطفیٰ کی آواز ہے...... تم صلہ ٔ رحم کرو۔ صلہ ٔ رحم یعنی اپنے خونی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک، ماں اور باپ کے عزیزوں اور رشتہ داروں اور بزرگوں کے ساتھ اور خوردوں کے ساتھ حسن سلوک۔ حسن سلوک کے یہ معنی نہیں ہوتے ہیں کہ آپ ان کو مال و متاعِ دنیا سے فائدہ پہنچاتے رہیں۔ نہیں اگر کوئی اس سے بے نیاز ہے تو اس سے حسن تخاطب، توضیحِ احوال، مزاج پرسی، ایک محبت اور اخلاص کے ساتھ سلام علیک........ یہ زندگی کو بڑھاتا ہے۔

ارے بھائی آپ محبت و اخلاص سے سلام کریں گے۔ سلام کے معنی سلامتی کے ہیں۔ آپ دوسروں کو سلامتی کا پیغام دیں گے تو وہ رب کریم کہے گا نہیں کہ بندہ ہو کر سلامتی کی دعا دے رہا ہے تو ہم خدا ہو کر اسے سلامت کیوں نہ رکھیں۔

بندہ ہو کر دوسرے کو سلامتی کی دعا دے رہا ہے، دوسرے کو سلامتی کا پیغام دے رہا ہے۔ میں خدا ہو کر اسے کیوں نہ سلامت رکھوں۔

تو یہ آپ کو حکمت و تدبیر بھی بتائی گئی۔ موت بڑھ سکتی ہے۔ موت گھٹ سکتی ہے۔ ہاں موت آنی ضرور ہے کہ اس نظام طبیعی اور اس کائنات طبیعی میں اظہارِ جلالِ روح کے لئے لازمی ہے۔

زندگی بھر روح کی تمام صلاحیتیں سامنے آتی رہیں۔ تمام صفتیں سامنے آئیں۔

ایک صفت سامنے نہیں آتی تھی کہ مادہ اتنا حقیر ہے کہ روح بغیر مادہ کے بھی باقی رہ سکتی ہے۔ یہ صفت سامنے کیسے آتی اگر موت نہ آتی۔ موت کا آنا آپ کی روح کے لئے شادمانی کا لمحہ ہے کہ ایک صفت چھپی ہوئی تھی وہ آج سامنے آ گئی۔

پھر گفتگو کو اسی موضوع کی طرف لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا یہی جبر کا استعارہ اختیار کا انگیزہ ہے۔ کیسے؟

ایک تو حدیث میں نے عَملاً عرض کر دی اور دوسری بات اب قرآن مجید کا ایک جملہ آپ کو سنا دوں۔ عزیزو! قرآن مجید میں آپ نے پڑھا ہے۔ سورۂ بقرہ میں بھی یہی فقرہ ہے ایک آیت کے اختتام پر۔ سورۂ جمعہ میں بھی فقرہ ہے ایک آیت کے اختتام پر۔ کیا ہے...... فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (آیت نمبر ۶)۔ سنتے ہیں نا آپ ہر جمعہ میں۔

تمنا کرو موت کی اگر تم سچے ہو۔

میں اس آیت کے تمام مضمرات پر تو گفتگو کر ہی نہیں سکتا لیکن ایک بات عرض کروں۔ قرآن مجید ہے کسی انسان کا کلام نہیں، کسی شاعر کا کلام نہیں، کسی ادیب کا کلام نہیں، کسی خطیب کا کلام نہیں........ قرآن مجید ہے عجزِ بیان کا نعوذ باللہ کوئی دخل نہیں۔ یہ نہیں کہ انتخابِ الفاظ میں غلطی ہوگئی۔ لفظِ تمنا کہاں استعمال ہوتا ہے۔ اگر چیز حتمی اور مقدر ہے تو تمنا کرنے کے کیا معنی؟ تمنا کے اس لفظ کو استعمال کر کے اس جبر کے استعارے کو اختیار کا انگیزہ بنا دیا قرآن نے۔

تمنا کرو موت کی........ کسی ایسی چیز کے لئے جو حتمی ہو اس کے لئے کہا جاتا ہے تمنا کرو؟....... ایک چیز یہاں رکھی ہے اور مامور ہوں کہ مجھے وہ چیز استعمال کرنی ہے، مامور ہوں، مجبور ہوں، مفر نہیں ہے۔ کہا جائے گا تمنا کیجئے اس کی؟........ بھئی تمنا تو اسی چیز کی ہوتی ہے کہ جو بلند تر ہو، رفیع تر ہو۔ اہم ہو، نفیس ہو، پاکیزہ ترین شے ہو۔ اس کی تمنا کی جائے گی۔ یعنی کہا جا رہا ہے کہ تم تمنا کرو کہ تمہارا جلالِ روح ظاہر تو ہو سکے۔

تمنا تک بات آئی...... موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

تمنا بھی زبان سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے۔

عزیزو......... دوستو! تمنا زبان کی صفت ہی نہیں ہے۔ تمنا زبان نہیں کرتی۔ تمنا تو قلب میں ہوتی ہے۔ تمنا تو دل میں ہوتی ہے۔ زبان سے تمنا کی ہی نہیں جاتی۔ اکثر تمنائیں جتنی عظیم ہوتی ہیں، زبان سے ظاہر ہی نہیں ہوتیں۔ جتنی عظیم، جتنی نفیس، جتنی پاکیزہ، جتنی اہم تمنا ہوگی زبان سے مشکل سے ادا ہوگی، تمنا میں ایک قوت ہوتی ہے، قوتِ اظہار ایسی ہوتی ہے کہ زبان بند ہو جاتی ہے اور پورے وجود سے تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔

خدا پاکیزہ تمناؤں سے آپ کا ظرفِ قلب بھر دے۔ خدا آپ کے ظرفِ وجود کو، ظرفِ قلب کو پاکیزہ ترین تمنا سے پُر کر دے۔ تو آپ دیکھیں گے، دل میں جب کوئی تمنا ہوتی ہے، زبان خاموش ہوتی ہے۔ آنکھوں سے تمنا ظاہر ہوتی ہے، چہرے سے تمنا ظاہر ہوتی ہے، قدموں سے تمنا ظاہر ہوتی ہے، پورے وجود سے تمنا ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے کربلا والوں کی تمنا ظاہر ہوتی رہی۔

تمنائے موت کوئی کربلا میں آ کر تو دیکھے.........!

آپ عزادار ہیں، اپنی قسمتوں پر جس قدر ناز کریں کم ہے، کہ اللہ نے آپ کو اس دنیا میں عزدار بنا کر بھیجا ہے۔ خدا کی قسم عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ محرم کا چاند نمودار ہوا اور بس آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

آج آپ نے ہلالِ محرم دیکھا۔ حسینؑ ابھی کربلا پہنچے نہیں، ابھی راہِ کربلا میں ہیں۔ آج حسینؑ نے کیا دیکھا ہوگا؟ کس منزل پر ہوں گے۔ مجھے ایک منظر یاد آ رہا ہے۔ میرے چشم تصور میں ایک منظر یہ ہے کہ حسینؑ کا قافلہ کربلا کے راستے میں ہے اور ہم نے جس طرح چاند دیکھا ایسے ہی دور سے کچھ نظر آیا۔ کچھ چہرے نظر آئے۔ اڑتی ہوئی گرد پہلے نظر آئی اور اس کے بعد کچھ لوگ نظر آئے۔ حسینؑ نے قافلے کو روکا اور کہا! علی اکبر آگے بڑھو، عباس آگے بڑھو۔ دیکھو کوفے سے کوئی آ رہا ہے۔ ذرا کوفے کے حالات تو دریافت کرلو۔

آنے والے قریب آئے۔ اور سید الشہداء امام حسینؑ کو سلام کیا۔ امام نے جواب دیا۔ چہروں کو دیکھا۔ آنے والوں نے کہا کہ ہم تنہائی میں کچھ عرض کریں گے، ہم سب کے سامنے بیان نہیں کر سکتے۔

امامؑ نے کہا: یہ غیر نہیں ہیں۔ یہ میرا بیٹا اکبرؑ ہے، یہ میرا بھائی عباسؑ ہے۔ جو بھی کہنا چاہو کہو۔ آنے والوں نے سر کو جھکایا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

کہا: آقا جب ہم کوفے سے نکلے تو آپ کے سفیر مسلمؑ کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر کوفے کی گلیوں میں لاش کو پھرایا جا رہا تھا۔

آپ نے ہلالِ محرم دیکھا۔ حسینؑ نے اس کے ساتھ کیا دیکھا، کیا خبر سنی۔ تو خیمہ کی طرف تشریف لائے کیونکہ قافلہ ٹھہرادیا گیا تھا۔ اب کچھ واقعات وہ ہیں جو مؤرخ بتاتے ہیں اور کچھ واقعات وہ ہیں جو اہل بیت کے گھرانے کی تہذیب کو پہچاننے والے، اداشناسان عصمت، وہ سمجھتے ہیں کہ کیا ہوا، وہ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوا۔ وہ چشم باطن سے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوا۔

حسینؑ نے مسلمؑ کی شہادت کی خبر سنی، خیمے میں آئے:

بہن زینبؑ، مسلمؑ کی بچی کو بلا کر لے آؤ۔ مسلمؑ کی بچی آئی اور حسینؑ نے ایک مرتبہ بچی کو خاص نظروں سے دیکھا۔ سر پر ہاتھ رکھا اور بچی تڑپ گئی: ارے میرے بابا کی خیر تو ہے۔

حسینؑ نے کہا: بیٹا تمہارے بابا راہِ خدا میں شہید ہوئے آج سے مجھے اپنے بابا کی جگہ سمجھنا۔

انا للّٰه و انا الیه راجعون ٥ رضا بقضائه و تسلیماً لامره

پروردگار! ہمیں علومِ قرآن اور معارفِ اہلبیت سے آشنا فرما۔ معبود ہمارے ذکر کو قبول فرما۔ ملتِ اسلامیہ کو تہذیب آلِ محمدؐ سے آشنا فرما دے۔ پروردگار! بحق فرزندِ زہراؑ امن وعافیت کا ماحول کرہِ ارضی پر قائم ہوجائے، معبود! سلطان عصر اور ولیِ زماں کو اذنِ ظہور عطا فرما کہ ہم اُن کے ہم رکاب دشمنانِ دین اور دشمنانِ انسانیت سے جنگ وجہاد کرسکیں۔

مجلس اول

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیمo

بسم اللہ الرحمن الرحیمo

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی اشرف الخلائق اجمعین الرسول النبی الامی الهاشمی سیدنا و شفیعنا ابی القاسم محمدٍ وعلیٰ اهل بیته الطیبین الطاهرین الهداۃ المهدیین المعصومین المظلومین واللعنة الدائمة علیٰ اعداء الدین اجمعینo

اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ عز اسمه فی محکم کتابه ومتقن خطابه o

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! مدرسہ حسینی کے طالب علمو! میرے عزیز ساتھیو! تفسیر فطرت کا مدرسہ کھل گیا۔ سال گزشتہ اسی منبر پر ان مجالس میں میرا موضوع تھا فطرت دین اور دین

فطرت ۔ میں نے جو کچھ بھی گفتگو کی تھی وہ ادھوری رہ گئی تھی، ناقص رہ گئی تھی۔ ویسے بھی کسی خاکی و خاطی سے بات پوری کب ہوتی ہے لیکن فطرتِ سلیمہ کہتے ہی اسے ہیں جو اپنی خطا اور اپنے نقص کو دریافت کرتی رہے، درک کرتی رہے اور اس کی تلافی کی کوشش کرتی رہے۔

جب یہاں سے جا رہا تھا تو یہی گزارش کی تھی کہ ان شاء اللہ سال آئندہ بھی یہی موضوع مسلسل رہے گا اور اس اعتبار سے اسی آیہ کریمہ کو سرنامۂ کلام قرار دیا گیا ہے جو سالِ گزشتہ تھی۔ سورۂ مبارکہ روم کی آیت ہے۔ سورہ بھی تیسواں ہے موجودہ ترتیب قرانی کے اعتبار سے اور اس سورہ میں آیت بھی تیسویں ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفا o بس بغیر کسی انحراف کے اپنا رخ دین کی طرف کرلو۔

فطرت الله التی فطر الناس علیها o

یہی فطرت الٰہیہ ہے جس پر اس نے تمہاری سرشت بنائی ہے۔ جس پر اس نے انسانوں کی طبیعتوں کو ڈھالا ہے۔

لا تبدیل لخلق الله o اللہ کی بنائی ہوئی خلقت میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

ذلك الدین القیم o یہی زندگی ساز دین ہے۔

ولكن اكثر الناس لا یعلمون o مگر لوگوں کی اکثریت جانتی نہیں۔

یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں قران کا واضح جملہ ہے کہ اکثریت جانتی نہیں ...... اکثریت کا قصور اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔ لیکن جو جانتے ہیں ان سے اس نے عہد لیا کہ تم پر واجب ہے کہ پیغام پہنچاتے رہو چاہے انسان خوش دلی سے سنے یا کراہت کے ساتھ۔ پہنچانا فرض ہے ان پر جو جانتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگر کوئی سننا نہیں چاہتا تو آپ سنانا کیوں چاہتے ہیں، اگر کوئی جاننا نہیں چاہتا تو آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ جان لے! ہم فطرت کے اس راز کو سمجھے نہیں جو خطیب نہج البلاغہ نے

ارشاد فرمایا ہے کہ "پروردگار نے جاننے والوں سے یہ عہد پہلے لیا کہ تم پہنچاؤ گے۔ پھر نہ جاننے والوں پر یہ فرض بعد میں کیا کہ تم جاننے سے دریغ نہ کرو گے۔"

اکثریت بہت سی باتوں کونہیں جانتی۔ فطرت کے راز ،اس کے کوائف کو بھی اکثریت نہیں جانتی۔ یعنی آغوش فطرت میں جی رہی ہے لیکن اُسی آغوش کونہیں پہچانتی۔ اور اس اعتبار سے مسلسل ضرورت ہے کہ اس موضوع پر گفتگو ہو۔ گو سب زبانوں پر ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ لیکن خود معنی فطرت بہت غامض ہے۔ سال گزشتہ کچھ مطالب عرض کئے تھے لیکن اس مرتبہ کچھ اور مطالب گزارش کرنے کا جی چاہتا ہے اور شروع ہی میں ایک تمہید آپ کے سامنے قائم کردوں تاکہ اس تمہید کے سہارے سے گفتگو آگے بڑھتی رہے۔

لہٰذا تمہیداً سوال ہے کہ کسی بھی چیز کو جاننے ، سمجھنے اور سمجھانے کے درمیان میں سب سے اہم عنصر کون سا ہے؟ ظاہر ہے کہ سب سے اہم عنصر علم ہے۔ جاننے کے معنی ہی علم ہیں۔ علم کے معنی ہی ہیں جاننا۔ تو علم کا قدم جب تک درمیان میں نہیں ہوگا اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ افہام وتفہیم کا کوئی بھی مرحلہ طے ہوجائے۔ کوئی بھی گفتگو آگے بڑھے۔ جہاں بھی افہام وتفہیم کا مسلسل سلسلہ رہے گا، جہاں بھی سمجھنے کا سمجھانے کا دروازہ کھلا رہے گا، سمجھئے وہاں علمی تفکر موجود ہے۔ جہاں افہام وتفہیم کا دروازہ بند کردیا جائے اس کا مطلب ہے کہ وہاں علمی تفکر کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

تو علم کہتے کسے ہیں؟

دیکھئے زندگی کے بنیادی سوالات وہی ہیں۔ ان سوالات سے رُوبرو ہونے والے تو مختلف ہوتے جاتے ہیں۔ ارسطو کے زمانے میں ارسطو نے انہی سوالات پر بحث کی۔ ملا صدرا نے اپنے زمانے میں انہی سوالات پر بحث کی۔ ارسطو اور ملا صدرا بدلے ہیں سوالات نہیں بدلے۔ افراد بدلتے ہیں۔ مسائل جو زندگی کے ہیں وہ اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن جب مسائل کا تذکرہ آگیا تو ایک جملہ کہتا چلوں تاکہ میری بوجھل فکری گفتگو ذرا

آپ کی اس سے بھی زیادہ بوجھل اور مشکل تر عملی زندگی سے مربوط ہو جائے۔

عملی زندگی آسان نہیں ہے، مشکل ہے اور وہ بھی انسانی زندگی۔ انسانیت کے رتبے سے گر جایئے تو سب کچھ آسان ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ انسانیت کے اس رفیع مرتبے پر قائم رہنا کہ اس سے گرنے نہ پائیں، اس سے نیچے نہ آنے پائیں، یہ سب سے بڑا امتحان ہے، یہ سب سے بڑی مشکل ہے، یہ سب سے بڑی آزمائش ہے، یہی سب سے بڑی ابتلاء ہے۔ لیکن اگر اس سے نیچے آ گئے تو پھر سہولتیں ہی سہولتیں ہیں جیسے چاہو زندگی بسر کرلو جہاں چاہو زندگی بسر کرلو۔

زندگی کہاں بسر ہو، کیسے بسر ہو یہ تو انسان کے لئے مسئلہ ہے غیر انسان کے لئے کہاں مسئلہ ہے۔ اس لئے ایک جملہ عرض کرتا ہوں۔

دیکھئے ہمارے ہاں ماشاء اللہ نہ مدبّرین کی کمی ہے نہ مفکّرین کی حالانکہ ۹۹ فیصد افراد جو اپنے کو مفکّر لکھتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ مفکّر ہوتا کیا ہے اور جو مدبّر کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے ہیں وہ جانتے نہیں کہ مدبّر ہوتا کیا ہے۔ عام سطح کی گفتگو کر رہا ہوں عام افراد کے لئے ورنہ مکتبِ اہلبیت سے وابستہ جو مدبّرین و مفکّرین ہیں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا تفکّر زیرِ سوال نہیں ہے، ان کا تدبّر زیرِ سوال نہیں ہے لیکن شرقِ ارض سے لے کر غربِ زمین تک شمالی کرہ سے لے کر جنوبی کرۂ ارضی تک مختلف ملکوں میں، مختلف معاشروں میں، مختلف زبانوں کے لوگ، مختلف تہذیبوں کے لوگ، مختلف Cultures سے وابستہ افراد، مختلف سیاسی نظاموں سے وابستہ افراد کرتے کیا ہیں؟ مدبّر کی حیثیت سے معاشرۂ انسانی کے سامنے ابھرتے ہیں نا!........کوئی اپنے شہر کے نظام کی تدبیر کرتا ہے۔ کوئی اپنے ملک کا مدبّر ہے اور کوئی چاہتا ہے کہ ساری کائنات کا مدبّر بن جائے۔

تدّبر اور تفکّر آسان نہیں ہے اور وہ بھی انسانی معاشرہ کے تعلق سے۔

مفکّر سوچتا ہے، مدبّر صرف سوچتا نہیں ہے، فکر کے قالب میں عمل کو ڈھالتا ہے۔ اور صرف اپنی زندگی ہی کو نہیں بلکہ جتنا بڑا مفکر ہوگا وہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی بالغ فکر

کے سانچے میں ڈھالتا چلا جائے گا۔ بہرحال مدبّرین انسانی معاشرے کے لئے مدبّرین ہیں، تدبّر کرنے والے نہیں، یا کیا ہیں؟ وہ اس سے سمجھ لیجئے کہ میں کہہ رہا تھا نا کہ مسائل بدلے نہیں ہیں اور یہی سیاسی سطح سے گفتگو ہوتی ہے، سماجی سطح سے گفتگو ہوتی ہے، عمومی فکری سطح سے گفتگو ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی سوالات تین ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان۔

ہزار برس پہلے بھی یہی مسئلہ تھا، ہزار برس بعد بھی یہی مسئلہ ہے۔ مسئلہ ضرور ہے اپنی جگہ لیکن ایک جملہ کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ جناب والا! انسان کی زندگی کے لئے، بحیثیت انسان جینے کے لئے یہ مسائل نہیں ہیں۔ روٹی کا مسئلہ مشترک ہے انسان اور حیوان کے درمیان غذائے مادی کا مسئلہ مشترک ہے، مکانِ مادی کا مسئلہ مشترک ہے، لباسِ مادی کا مسئلہ مشترک ہے۔ انسان کو بحیثیت انسان جینے کے لئے اس سے بلند تر مسائل درپیش ہیں۔

اور انسانی معاشرے کے مدبّرین وہ ہیں جو ان بلند تر مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، یہ تو مشترک مسائل ہیں۔ آپ کسی حیوان کو اپنے گھر میں پال کر دیکھئے اس کو بھی غذا کی ضرورت ہے یا نہیں!......... اس کی بھی غذا کا مسئلہ ہے۔ آپ کی بھی غذا کا مسئلہ ہے۔ جو مسائل مشترک ہیں حیوان و انسان کے درمیان، آپ اسے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس سے بڑی انسان کی توہین نہیں ہے۔ انسانی مسائل کچھ اور ہیں۔ وہ مسائل علم و عرفان سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ انسان کا امتیاز ہی دوسری مخلوقات سے بر بنائے علم ہے۔

تو عزیزانِ محترم! جب بھی انسان بحیثیت انسان گفتگو کرے گا اس کی گفتگو علمی ہونی چاہئے۔ جب بھی انسان بحیثیت انسان کسی مسئلہ پر نظر ڈالے گا تو اس کے پاس علمی استدلال ہونا چاہئے۔ علم ہی مدنظر ہونا چاہئے۔ صرف مادہ نہیں۔ مادہ اور علم خود ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔

لیکن ان سنگین مسائل کو آج پہلی ہی مجلس میں نہ چھیڑتے ہوئے میں تیزی سے ایک تمہید اور ایک مقدمہ عرض کردوں اور وہ یہ ہے کہ سال گزشتہ کی مجالس میں اگر آپ کے اذہان عالیہ میں محفوظ ہو تو میں نے گزارش کی تھی اور یہ تمہید کبھی نہیں تبدیل ہوگی یہ مقدمہ ضروری ہے، منطقی ہے، فلسفیانہ ہے، یہ مقدمہ اپنی جگہ اصل رہے گا کہ فطرت کو دریافت کرنے کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں؟ صرف خلاصۂ مطلب۔ علم ضروری ہے بحث کرنے کے لئے لیکن علم کیسے پیدا ہوتا ہے۔ علم وجود میں کیسے آتا ہے؟........ یہ مسئلہ اپنی جگہ الگ کہ علم تو موجود ہے۔ اب وہ وجود میں آنے والا نہیں ہے۔

علمِ خالص، علمِ حقیقی تو صفتِ ذاتِ الٰہی ہے۔ وہاں نہ تغیر ہے نہ حدوث ہے۔ وہ تو ہے۔ کب سے ہے کب تک رہے گا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ازلی ہے، ابدی ہے۔ تو علم تو ہے موجود، علم تو ہے اصلِ وجود اب کوئی علم وجود میں آنے والا نہیں ہے لیکن ظرفِ ذہنِ انسانی میں علم کہاں سے آتا ہے اور علم کہتے کسے ہیں؟

عام طور پر یہ مسائل وہ ہیں جو صرف فلسفہ کی کلاسوں میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ یونیورسٹیز میں یا حوزہ ہائے علمیہ میں۔ مگر آپ میری عادت سے واقف تو ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ درس گاہ کے مسائل زندگی کی رزم گاہ سے الگ رہیں۔ انسانی درس گاہوں کے مسائل انسان کے حیاتی رزمیہ سے مربوط ہونے چاہئیں، جو ہماری زندگی کا رزمیہ ہے اس سے مربوط ہونا چاہئے۔

تو یہ علم ہے کیا؟.......... Epistemology میں بحث کرتے ہوں گے لوگ اپنے انداز سے، میں عرض کروں۔ مسلمہ امر ہے پچھلے سال عرض کر چکا۔ صرف سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ جو کچھ بھی ہم خارج سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اپنے حواس خمسہ کے ذریعے سے۔ سب کو معلوم ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ حواس خمسہ (یعنی) لامسہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور سامعہ۔ یہ پانچ جو senses ہیں ہمارے پاس یہ ذریعہ اخذ و تحصیل و کسبِ علم ہیں۔ علم حاصل کرتے ہیں باہر سے۔

اب جو گفتگو کر رہا ہوں وہ اس سے قبل عرض نہیں کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا چیز حاصل کرتے ہیں آپ؟......... عالمِ خارج میں ہے کیا؟ آپ کی ذات کے باہر کیا چیز ہے۔ کیا چیز منتقل ہوتی ہے۔ Scientist لیبارٹری میں بیٹھ کر کیا چیز جذب کر لیتا ہے؟ فلسفی اپنے فلسفیانہ تفکر کے ذریعے کس چیز کو جزو ذات بنالیتا ہے؟ طالب علم، طلبِ علم کے سلسلے میں کس چیز کو absorb کرتا ہے؟

ہمارے عالمِ خارج میں زمین ہے، ہمارے عالمِ خارج میں ہوا ہے۔ ہمارے عالمِ خارج میں درخت ہیں، ہمارے عالمِ خارج میں پہاڑ ہیں، پتھر ہیں، سنگ ریزے ہیں، ہم نظر ڈالتے ہیں ستارے نظر آتے ہیں، سورج نظر آتا ہے، چاند نظر آتا ہے۔

ہم نظر اٹھاتے ہیں تو کیا نظر آتا ہے؟ زمین، آسمان، درخت، پہاڑ، دریا، سمندر، حیوان، پرند۔ مختلف قسم کے مخلوقات نظر آتے ہیں۔ جب تک یہ چیز باہر ہے پتھر کہلاتی ہے؟ جب تک کوئی شے خارج میں ہے پانی ہے۔ جب تک کوئی شے خارج میں ہے دریا ہے۔ جب تک کوئی شے خارج میں ہے سمندر ہے، جب تک کوئی شے خارج میں ہے ستارہ ہے، جب تک کوئی شے خارج میں ہے زمین ہے، خاک ہے اور جب یہ شے ذہن میں منتقل ہوگئی تو علم بن گئی۔

سمجھ میں آ گئی بات! میں particular terminology سے اور وہ diction جو فلسفہ کا ہے اس سے ہٹ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ جب تک باہر ہے دیوار ہے۔ اسے آپ علم کہیں گے یا دیوار؟ یہ دیوار ہے؟ یہ درخت ہے، جائیے سیر کیجئے پہاڑ ہے، انگلی اٹھائیے، ہمالیہ کیا ہے؟ .... پہاڑ۔ فرات کیا ہے؟ .... دریا......... دجلہ کیا ہے؟....... دریا۔ زمزم کیا ہے؟......... چشمہ۔

ارے خدارا! اس مرحلہ سے کامیابی سے گزرنے کی کوشش کیجئے۔ جب تک خارج میں ہے ہر شے الگ الگ ایک نام رکھتی ہے۔ کوئی لوہا ہے کوئی چاندی ہے، سونا ہے، پتھر ہے، سنگ ریزہ ہے، درخت ہے، زمین ہے، آسمان ہے، ہوا ہے، یہ عناصر میں بکھری ہوئی

کائنات جب اس کا عکس ذہن انسانی میں منتقل ہوجاتا ہے تو پھر صرف ایک نام ہی رہ جاتا ہے .... علم۔

جب تک خارج میں ہے پتھر، ذہن میں آ گیا علم۔ خدا نہ کرے کسی کی عقل پر پتھر پڑ جائیں۔ عقل پر پڑنا اور ہے اور ظرفِ عقل میں سمانا اور ہے، فرق ہے۔

بہت دقیق مسئلہ ہے، بہت پیچیدہ مسئلہ ہے، بہت الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ تو باہر جب تک ہے درخت، اور ظرف ذہن میں اس کا عکس جب آ گیا تو اب وہ درخت نہیں ہے، درخت کا علم ہے۔ ذہن میں علم ہے، ماہیت منتقل ہوئی ذہن میں، علم ہے۔

اب اس گفتگو سے آگے بڑھوں۔ جب تک عالم خارج میں ہیں تو مختلف نام۔ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے راز کو کاش سمجھ جائے کوئی اس نکتہ کو درک کرنے کے بعد۔ جب تک خارج میں ہے ایک عالمِ کثرت۔ اتنے نام ہیں اشیاء کے کہ اِحصَا نہیں ہوسکتا۔ ہر ذرہ کا الگ نام رکھ لیجئے تو بجا۔ لیکن جب یہ پوری کائنات سمٹ کر ظرفِ ذہن میں آ گئی اب صرف ایک نام کے تحت سب چیزیں ہیں اور وہ ایک نام ہے علم۔

سب جھوم رہے ہیں۔ کیوں جھوم رہے ہیں؟.......... آپ کا قصیدہ پڑھ رہا ہوں نا ؟....... آپ ایک حقیر انسانی وجود، ایک خاکی، ایک خاطی، ہمارے ماں باپ خاکی خاطی، ہمارے ماں باپ گنہگار، ہم گنہگار، ہمارے ماں باپ ضعیف، ہم ضعیف و ناتواں۔ ہمارے ماں باپ اپنی ماں کے پیٹ سے جاہل پیدا ہوئے، ہم اپنی ماں کے پیٹ سے جاہل پیدا ہوئے۔ اور ہم نے اس دنیا میں آنے کے بعد کتنا علم حاصل کیا؟

جس چیز پر نظر پڑی، اسے جزوِ ذہن بناتے چلے گئے اور ایک دن وہ آیا کہ ہم اپنے لئے علمیت ؟ کے قائل ہونے لگے۔ ہم اپنے کو بہت بڑا دانشور سمجھنے لگے، ہم اپنے کو بہت بڑا scientist سمجھنے لگے۔ ہم نے یہ اعلان کردیا کہ کائنات کا جو راز سمجھنا ہو ہم سے سمجھو۔ ہم آئن سٹائن ہیں، ہم Stephen Hopkin ہیں، ہم ملا صدرا ہیں، ہم ارسطو ہیں، ہم ملا ہادی سبزواری ہیں، ہم یہ سب کچھ ہیں۔ ہم یعنی انسان۔ ایک عام

انسان اس کائنات میں پیدا ہونے کے بعد حواس خمسہ ظاہر یہ کی مدد سے جب کائنات کے عکس کو اپنا جزو ذہن بنالیتا ہے تو اپنی ذات کو کیسا محیط تصور کرتا ہے کہ ہر چیز پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ارے اپنی ذات سے قیاس کرو اس کو کہ جس کو پروردگار کہتا ہے: ہم نے اسے علمِ کُل بنا کر بھیجا۔

کاش اس مرحلے کو دنیا سر کرے، طے کرے، آگے بڑھے، سمجھے کہ جناب آئن سٹائن جب کہہ سکتے ہیں: ہم آسمانوں کے راز بتا سکتے ہیں، ہم روشنی کی رفتار بتا سکتے ہیں......... یہاں پیدا ہونے کے بعد اپنے حواس خمسہ سے، اس کائنات کا عکس قبول کرنے والا انسان، جدوجہد کے بعد، بصیرتِ علمی کو کام میں لاکر، فکر کو استعمال کرکے یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ہم فضائے کائنات کے احکام بیان کرسکتے ہیں تو پھر اس کے کلام پر کیوں کر شبہ کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں خدا نے کہا ہو:

و کل شیءٍ احصیناہُ فی امام مبینo

ہم نے تو خود ہر شے کا اِحصَا امام مبین کی ذات میں کردیا ہے۔

اب وہی امام مبین اگر منبر پر آکر کہے: سلونی سلونی قبل ان تفقدونی o پوچھ لو پوچھ لو مجھ سے، اس سے پہلے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں۔ اور یہ بھی فرمایا۔ آسمان کے راستوں کو میں تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔

اَب اِس بات میں کوئی اِغماض تو نہیں ہے؟ کوئی گرہَ رہ تو نہیں گئی؟ یہ عقیدہ ہے عقدہ نہیں۔ عقدہ کشاء کا بیان ہے یہ۔ اور ہم اس عقیدے سے وابستہ ہیں۔

اب جب یہاں تک بات آگئی تو ایک مسئلہ سمجھئے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا دیکھئے تو۔ کہاں سے کہاں تک فاصلہ ہے، کتنا تفاوت ہے، مراتب میں، مقامات میں، کس قدر تفاوت ہے۔ ارے معراجِ مصطفےٰؐ کو کوئی کیا سمجھے گا؟ اس کو تو سمجھنے کی کوشش کرے جو کہتا رہا کہ میں مصطفےٰؐ کے غلاموں میں سے ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ کوشش تو کرے دنیا!......... یہ عام افراد جو اس دنیا میں صفحہ سادہ لے کر آئے، ظرف خالی لے کر

آ ئے۔ انھوں نے حواس خمسہ کی مدد سے، کائنات کے مطالعہ کے بعد اپنی ذات کو کیسا محیط علم بنالیا......... بنالیا یا نہیں ! میں کسی کے علم کا مُنکر نہیں ہوں، کسی کی معلومات کا مُنکر نہیں ہوں۔

یہ الگ بات ہے کہ اب تک مجازاً علم کا لفظ استعمال کرتا رہا۔ انسان معلومات رکھتا ہے، علم نہیں رکھتا۔ یہ بات الگ ہے۔ زیر بحث آئے گی کہیں تو عرض کردوں گا کہ علم اور معلومات میں رتبہ کا کیا فرق ہے یہ ثَنَوِیّت کہاں سے آ گئی، یہ duality کہاں سے آ گئی۔ رتبے کا کتنا فرق ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیئے کہ وہ انسان جو رحم مادر سے نادان پیدا ہوا، وہ اگر دانائی کی دارائی رکھتا ہے تو وہ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی معلومات حاصل کرتا رہتا ہے ایک ایک شے کا علم حاصل کرتا ہے یعنی معلومات حاصل کرتا ہے۔ حرف ذہن پر منطبق ہوتا رہتا ہے کبھی غلط، کبھی صحیح۔ ذہن ریاضیاتی طور پر کام کرتا رہتا ہے، محاسبۂ نفس ہوتا رہتا ہے اور اس کے بعد تصور تصدیق میں بدلتا رہتا ہے اور پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان واقعاً اپنی معلومات اَستحق پہ حکم فرما ہوتا ہے۔ اور یہ سب کون انسان کرتا ہے جو صفحۂ سادہ لے کر آیا تھا، جو رحم مادر سے نادان پیدا ہوا تھا، اور وہ بھی صرف حواس خمسہ کے ذریعے سے، اور اب کیا کہوں کہ یہ خمسہ کے عدد کا کرشمہ بھی کہاں کہاں دیکھئے گا۔

حواس خمسہ ہی ہیں نہ سِتّہ نہ اَربَعہ۔

اب ایک مرحلہ اور۔ گفتگو کو ذرا آگے بڑھادوں۔ خارج میں جو چیزیں ہیں ان کی عکس برداری کے بعد، ان کے فوٹو گرافس لینے کے بعد، حواسِ خمسہ کے ذریعے سے خارج میں جو معلومات ہیں وہ جُزوِ ذہن بنیں لیکن یہ نکتہ نہ بھولئے گا کہ جب تک خارج میں یہ چیزیں تھیں آپ کسی بھی طور پر ان پر لفظِ علم کا اطلاق نہیں کر رہے تھے.........

کسی پہاڑ کو دیکھ کر کوئی بچہ پوچھے: یہ کیا ہے؟ ....

آپ کہیں: علم ہے بیٹا! صحیح ہے جواب.......؟

جواب یہی ہے: پہاڑ ہے بیٹے۔

کسی درخت کو دیکھئے۔ اب درخت تو مختلف ہیں۔ کہیں آم کا درخت ہے اور کہیں لیچی کا۔ (میرے بعض دوست کہتے ہیں کہ پاکستان میں لیچی کا درخت نہیں ہوا کرتا، مجھے معلوم نہیں ہے۔ میری جنرل نالج بہت کمزور ہے)......... اب وہ آپ کا چھوٹا بچہ گیا آپ کے ساتھ اور بچوں کی تو طبیعت میں سوالات ہی سوالات ہیں۔

اس نے کہا: یہ کیا ہے؟ آپ نے کہا:......... یہ آم کا درخت ہے،

اس نے کہا، یہ کیا ہے؟......... یہ امرود کا درخت ہے۔

یہ کیا ہے؟......... یہ لیچی کا درخت ہے۔ تو بات صحیح ہے بالکل درست جواب ہے۔

اور اگر اس نے آم کے درخت کے پاس پوچھا: بابا یہ کیا ہے؟......... یہ علم ہے بیٹا......... لیچی کے درخت کے بارے میں کہا: یہ علم ہے بیٹا۔ آپ سب چیز کو کہتے رہیئے علم ہے بیٹا۔ پتھر کیا ہے؟ علم ہے بیٹا، درخت کیا ہے؟ علم ہے بیٹا۔ تو بات صحیح نہیں ہوگی۔ جب تک خارج میں ہے یہ لفظ اطلاق کر نہیں کر سکتے۔

یہ بات ذہن میں رہے جب تک خارج میں ہے اسے علم کا نام نہیں ملے گا۔ اسی کی ماہیت جب ذہن انسانی میں آ جائے تو پھر علم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خارج میں جو چیزیں بکھری ہوتی ہیں جب تک وہ جُزوِ ذاتِ انسانی نہ بن جائیں علم نہیں کہلاتیں۔ (کہیں کام آئے گی یہ بات!)

اس بحث کو اچھی طرح تمام میرے علم و دانش پسند احباب ذہن نشین کرلیں۔ ہم جب تک کائنات مادی کا مطالعہ کریں گے۔ یہ نہیں کہہ رہا ہوں مطالعہ نہ کیجئے۔ خوب مطالعہ کیجئے۔ اس کائنات مادی کو آپ کی ٹھوکروں میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ آپ اس کو جانچیں، پرکھیں، تولیں۔ اس کی ماہیت کو جزوِ ذہن بنائیں۔ اور اس کی حقیقت کو اپنے تصرف میں لائیں۔ کائنات اسی لئے آپ کے لئے پیدا ہوئی ہے کہ آپ اِس مادہ پر تصرف کریں۔

اگر آپ نے لوہے کو پگھلا کر ہوائی جہاز نہیں بنایا تو آپ نے کوئی انسانی کام انجام

نہیں دیا۔ پیدا ہی یہ شے اس لئے کی گئی کہ آپ کا تصرف اس پر ہو۔لوہا آپ کے لئے مسخر کیا گیا۔ یہ طے ہے۔ ہوا مسخر کی گئی آپ کے لئے۔ کیا معنی ہیں ہوا کو مسخر کرنے کے۔ یعنی ہوا میں تو سب چیزیں ہیں۔ آکسیجن بھی ہے، ہائیڈروجن بھی ہے، ہیلیم بھی ہے، نائٹروجن بھی ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی ہے۔ مسخر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس میں سے آکسیجن کو جدا کر کے محفوظ رکھیں، ایک جن کو بند کریں بوتل میں اور جب کسی کی سانس گھٹنے لگے تو آکسیجن دیدیں۔ یہ تسخیر کے معنیٰ ہیں کہ نہیں؟

بھئی وہ ایک مریض ہے اور اس عام فضا میں جس میں سب سانس لے کر جی رہے ہیں وہ نہیں جی پارہا ہے۔ اسی سے سب آکسیجن لے رہے ہیں وہ نہیں لے پارہا ہے آکسیجن۔ تو اس کے لئے خصوصیت سے آکسیجن علیحدہ سے دینا پڑے گی۔ تسخیر کیا نا آپ نے۔ لوہا مسخر کیا، ہوا کو مسخر کیا، ہر چیز کو آپ مسخر کررہے ہیں۔ یہ پیدا ہی اس لئے ہوئی ہیں کہ تسخیر کریں آپ۔

خارجی دنیا کو مسخر کریں۔ خارجی دنیا کو ذہن کا جُز بنائیں تو وہ علم کہلائے گا۔ اس ایک نکتہ پر آج زور دینا چاہتا ہوں کہ جب تک چیز خارج میں ہے علم نہیں کہلائے گی جب تک جزوِ ذاتِ انسانی نہ بن جائے۔ اب اگر میں صرف یہ بات کہوں کہ عزیزو! علم حاصل کرو، براہ راست علم۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہہ رہا ہوں کہ جا کر پہاڑ کا مطالعہ کرو، دریا کا مطالعہ کرو، درخت کا مطالعہ کرو۔ اس لئے کہ تمہارے مطالعے میں غلطی کا امکان ہے۔

تصویر صحیح منتقل ہوئی یا منتقل نہیں ہوئی۔ تصور کو تصدیق میں صحیح طور پر بدلا یا نہیں بدلا۔ ریاضیاتی حساب مکمل ہوا یا مکمل نہیں ہوا۔ کہیں کوئی error تو نہیں آ گیا، کہیں کوئی mistake تو نہیں ہوگئی۔ جہاں غلطی آئی وہاں علم تو مصدق نہیں ہوگا۔ یعنی خارجی دنیا میں علم نہیں ہے۔ علم تو وہ شے بنتی ہے شعور انسانی بننے کے بعد۔

اب اگر کہا جائے، کوئی کہنے والا دعوت دے رہا ہو: علم حاصل کرو، علم حاصل کرو،

علم حاصل کرو۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لیباریٹری میں جا کر پہلے تجزیہ کرو۔ تمہارے تجزیہ کے نتیجے میں علم بھی حاصل ہوسکتا ہے، تَوَہم بھی قائم ہوسکتا ہے۔ تم وہم میں بھی مبتلا ہوسکتے ہو۔ غلطی بھی کرسکتے ہو۔ جب کہا جائے گا علم حاصل کرو۔ تو وادی میں جا کر نہ بیٹھو۔ کسی ایسے شخص کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ کہ جس کی ذات میں علم موجود ہو۔

اسی لئے کائنات کے مُعلّمِ اعظم نے، رسول رحمتؐ نے، خاتم النبیینؐ نے جب اعلان کیا: علم حاصل کرو۔

اطلب العلم من المهد الى اللحدo

علم حاصل کرو گہوارے سے لے کر گور تک۔ آغوش مادر سے آغوش قبر تک علم حاصل کرو۔ کہتے رہے علم حاصل کرو۔ مگر کہاں سے حاصل کرو تو کہا:

انا مدينة العلم و علی بابهاo میں علم کا شہر ہوں علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔

بات سمجھ میں آئی ؟........ حضور نے کیا کہا ؟ جب تک چیزیں خارج میں ہیں علم نہیں ہیں، تصویریں لیتے رہو۔ کتنے سیاح اچھے سے اچھے کیمرے لے کر natural scenries کی تصویر کشی کیا کرتے ہیں۔ جزوِ ذہن بھی بنتی ہیں تصویریں یقیناً۔ فوٹو گراف بھی بنتے ہیں۔ گھروں میں دیواروں پر بھی سجا دیتے ہیں لوگ لیکن ہر عکس بردار scientist نہیں بنتا، ہر سیاح فلسفی نہیں بن جاتا۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ کائناتِ خارجی کا مطالعہ کرنے والا کسی علمی نتیجے تک پہنچ ہی جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ دروازۂ علیؑ پر آنے والا بےعلم پلٹ جائے۔

پہاڑوں سے سر ٹکراؤ گے۔ کچھ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں اور ممکن ہے کہ سر شگافتہ ہوکر رہ جائے۔ سر سالم بھی رہ گیا تو آئینۂ قلب پارہ پارہ ہوسکتا ہے۔ آئینۂ ذہن ریزہ ریزہ ہوسکتا ہے۔ نفس پاش پاش ہوسکتا ہے۔ اوراقِ ذات انسانی بکھر سکتے ہیں ہواؤں میں۔ مگر ایک مکمل صحیفہ کی صورت تب ملے گی جب وہاں آؤ گے کہ جن کے وجودات الٰہی صحیفے ہیں۔

اب ایک مرحلہ اور!

اب تک میں نے عرض کیا کہ عالمِ خارجی سے جو کچھ آپ لیتے ہیں اس کے بعد جزوِ ذات انسانی بننے کے بعد وہ چیز علم کہلاتی ہے اور خارج سے کسبِ معلومات کے لئے، معلومات حاصل کرنے کے لئے حواسِ خمسہ درکار ہیں۔ لیکن یہ بتایئے کہ جو داخل میں علم ہے، حقیقتاً اس کو خارج میں بھیجنے کے لئے کون سے وسائل ہیں۔ ہے نا ایک نیا سوال ؟......... غالبًا یہ نیا سوال ہے۔

تمام کتابیں جو شروع ہوتی ہیں Theory of knowledge اور نالج سے متعلق Issues کو لے کر تو وہ یہ کرتی ہیں کہ علم کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ خارج سے ہم علم لیتے ہیں۔ مادی کائنات سے ہم علم لیتے ہیں، اور حواس خمسہ سے ہم علم لیتے ہیں، آنکھوں کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ کان کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے، زبان کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے، لامسہ سے، شامہ سے، سامعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب اشتباہ ہے علم نہیں حاصل ہوتا۔ کچھ تصویریں آتی ہیں بکھری ہوئی۔ علم تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

خارج سے عکس برداری کے لئے یہ حواس ہیں۔ داخل میں جو علم ہے، جو علم ہے حقیقتاً، یہ خارج میں کیسے منعکس ہوتا ہے؟........ کن وسائل کے ذریعے سے؟

اب بہت تفصیلی گفتگو کو بہت مختصر کر کے عرض کروں۔ عام طور پر اب تک جتنا بھی scientific work ہوا ہے جو کچھ بھی education philosophy میں کام ہوا وہ سب یک طرفہ ہے کہ خارج سے معلومات کیسے حاصل کریں۔ اس پر کام نہیں ہوا کہ داخل کا علم خارج میں کیسے منعکس کریں۔

اس پر کام نہیں ہوا یا زیادہ نہیں ہوا۔ اب یہ بتایئے کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟

خارج سے معلومات لینا ضرورتِ حیاتِ انسانی ہے۔ انسان بحیثیت انسان، اپنی انسانیت اور اپنی عزتِ الٰہی، عزتِ معنوی، عزتِ حقیقی اپنی انسانی آبرومندی کو قائم کرنے کے لئے ایک ضرورت ہے اس کی کہ خارج سے معلومات کو حاصل کرے۔ جتنی ضرورت

ہے اس کی کہ خارج سے معلومات کو حاصل کرے اتنی ہی ضرورت ہے اس کی کہ جو داخل میں علم ہے اسے منعکس کرے۔

آپ کہیں گے ہاں سوال تو ٹھیک ہے۔ نئے طریقے سے آپ نے کوئی بات کہی ہوگی۔ ذرا سوال بنا کے پیش کررہے ہیں آپ ورنہ بات تو کوئی خاص نہیں ہے۔ ارے کتاب ہے، قلم ہے، تقریر ہے، تحریر ہے، صنعت ہے، حرفت ہے اسی طرح تو علم خارج ہوتا ہے۔ اندر کا علم ایسے ہی تو آتا ہے باہر۔ عالِم کیا کرتا ہے۔ اپنے علم کے اظہار کے لئے ؟......... کتاب لکھتا ہے۔ شاعر کیا کرتا ہے اپنے علم کے اظہار کے لئے؟ .... شاعری کرتا ہے۔ ایک صاحبِ خبر انسان کیا کرتا ہے اپنی اطلاع وخبر کے اظہار کے لئے؟ ....خطابت کرتا ہے۔

ایک شخص جو جمالیاتِ کائنات کا ادراک کرتا ہے وہ اپنے ادراک وعلم کو ظاہر کرنے کے لئے کیا کرتا ہے ؟ نقاشی کرتا ہے یہی ہے نا! کتاب لکھتا ہے، شاعری کرتا ہے، خطابت کرتا ہے، نقاشی کرتا ہے، سنگ تراشی کرتا ہے، صنعت وحرفت کو کام میں لاتا ہے، یہ سب اپنی جگہ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ حواسِ خمسہ ِ ظاہری، باہر سے معلومات حاصل کرنے کے نہایت کمزور اور ناقص ذریعے ہیں۔ضروری نہیں ہے کہ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کی ہوئی تصویر کوئی صحیح علمی نتیجہ بھی عطا کردے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو نفسِ انسانی کے اندر معلومات ہیں، علم ہے وہ شاعری کے ذریعے سے پوری طرح ظاہر ہوجائے، وہ کتاب لکھ کر پوری طرح ظاہر ہوجائے، وہ تقریر میں پوری طرح ظاہر ہوجائے۔ یہ سب بھی ناقص وسائل ہیں۔

دستِ ادب جوڑ کر عرض کررہا ہوں خدارا اس مرحلۂ فکر کو آسانی کے ساتھ سر کرلیں۔ آپ بتائیں تو سہی !ارے ہم تھوڑا سا علم حاصل کرتے ہیں تو بے چین رہتے ہیں کہ جلدی سے کوئی کتاب لکھیں کہ ہمارا مصنفین کی فہرست میں نام لکھ دیا جائے، جلدی سے مجموعہ کلام شائع ہوجائے۔ کم از کم شعراء کی فہرست میں نام آجائے۔ دو چار

نقاشیاں بنالیں اب جلدی سے کسی انٹرنیشنل آرٹ گیلری میں exhibition لگ جائے تاکہ پتہ چلے میں بھی آرٹسٹ ہوں، کچھ شعور رکھتا ہوں۔ کچھ فن رکھتا ہوں۔

ارے ناقص افراد کے اندر اظہارِ علم کی کیا بیتابی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اظہار علم کی بیتابی نہیں ہے اضطرابِ جہل ہے۔ اور اسی لئے ایک سوال کروں بہت سخت !.......
یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ، قلم، خطاب، موقلم، لوحِ مرقع، صفحۂ مرقع نگاری، سنگ اور سنگ تراش، جتنے بھی وسائلِ علم وفکر وشعورِ بشری ہیں یہ سب ناقص ہیں۔ ہمارا قلم صحیح سمتوں میں بھی چل سکتا ہے، غلط بھی لکھ سکتا ہے۔ ہمارا شاعر شعور کی صحیح ترجمانی بھی کرسکتا ہے اور اس کا شعور بھٹک بھی سکتا ہے۔ قران مجید گواہ ہے:

والشعراءُ یتبعهم الغاون٥ (سورۂ شعراء آیت ۲۲۴)

شعراء تو وہ ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

یہ شعراء کی توہین نہیں کررہا ہوں۔ وہ شعراء بہت محترم ہیں جو ذکرحق سے وابستہ ہیں۔ وہ شعراء بہت محترم ہیں کہ جو انتصار مظلوم کا کام کررہے ہیں، جو ظلم کے خلاف آواز اٹھارہے ہیں، جو حق کا ساتھ دے رہے ہیں، جو امن و عدل و عافیتِ بشری کی باتیں کررہے ہیں۔ وہ شعراء وہ خطباء بہت محترم ہیں تاہم معصوم نہیں کوئی بھی۔ یہ سب غلطی کرسکتے ہیں۔ علماء، خطباء، شعراء سب غلطی کرسکتے ہیں۔ کتاب غلط لکھی جاسکتی ہے۔ تقریر میں، میری تقریر میں کوئی غلط بات آسکتی ہے۔

تو معلوم ہوا یہ سب جس طرح کسبِ علم کے، کسبِ معلومات کے، خارجی دنیا کی فوٹوگرافی کرنے والے جو وسائل ہیں حواس خمسہ ہمارے یہ ناقص ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاس جتنے بھی وسائل ہیں (بات ذرا مشکل ہے مگر آپ اس منزل پر پہنچیں گے ان شاء اللہ کہ جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے) جو ذاتِ انسانی میں، شعورِ انسانی میں، ظرفِ نفسِ انسانی میں، قلبِ انسانی میں جو جوہرِ پاکیزہ ہے جس کو علم کہتے ہیں اس کے خارجی دنیا میں اظہار کے لئے جو ذرائع ہیں، جو وسیلے ہیں یہ سب بھی ناقص ہیں۔

اسی لئے تو کسی نبی نے، کسی اللہ کی طرف سے آنے والے ولی اللہ نے، منصوص من اللہ نے شاعری بھی نہیں کی۔ کسی نے یہ کوشش نہیں کہ مصنف کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آؤں۔ مصنف، ادیب، شاعر، خطیب سب نازاں ہوتے ہیں، سمجھتے ہیں اظہارِ علم کے لئے یہ ہی وسائل ہیں۔ آپ بتایئے تو سہی کہ آدم علیہ السلام نے کوئی کتاب لکھی؟ نہیں لکھی۔ آدمؑ کو صحیفہ دیا گیا یہ الگ بات ہے خود نہیں لکھی۔ ابراہیمؑ نے موسیٰؑ نے، عیسیٰؑ نے حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی کتاب لکھی؟ ....شاعری کی؟ ....کسی پیغمبر نے کسی نبی نے شاعری نہیں کی۔

یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ شعر کہنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ شعر نہ کہنا الگ ہے نہ کہہ سکنا الگ ہے۔ نہ لکھنا الگ ہے نہ لکھ سکنا الگ ہے۔ نہ پڑھنا الگ ہے نہ پڑھ سکنا الگ ہے۔ پڑھ سکتے تھے مگر نہیں پڑھا۔ لکھ سکتے تھے مگر نہیں لکھا۔ یہ نہیں کہ نہیں کر سکتے تھے۔

میں یہیں پر ابھی تقریر ختم کر سکتا ہوں۔ ابھی اتر جاؤں گا تقریر ختم ہو جائے گی۔ تقریر ختم کر سکتا ہوں لیکن نہیں کروں گا۔ یہ جو تقریر آپ کے سامنے کر رہا ہوں یہ لکھ کر پڑھ سکتا ہوں تو معلوم ہوا کہ کل سے یہی تقریر لکھ کر لاؤں اور کھڑا ہو کر آپ کے سامنے پڑھوں، کر سکتا ہوں یہ کام یا نہیں؟ لکھ سکتا ہوں، لکھا ہوا پڑھ سکتا ہوں مگر لکھوں گا نہیں، اس لئے کہ اس منبر کی شان کے خلاف ہے۔ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ لکھنے کا موقع الگ ہوتا ہے، بولنے کا موقعؑ الگ ہوتا ہے اور جب نفس میں علم ہوگا تو جہاں لکھنے کا موقع ہوگا اگر وہاں بھی لکھنے نہ دیں گے تو اظہار علم ہو کر رہے گا۔ جس کا علم کامل ہو وہ ناقص وسائلِ اظہارِ علم کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔

جتنا عرفان بڑھتا جاتا ہے بیان کوتاہ ہوتا جاتا ہے۔ عرفان بڑھتا چلا جائے گا بیان سمٹتا چلا جائے گا۔ جب عرفان لامحدود ہوگا تو بیان نقطہ میں سمٹ جائے گا۔ جب عرفان بیکراں ہو جائے گا، لامتناہی ہو جائے گا، قابل تسخیر نہیں رہے گا، جب کاف ونون کی کشش

بھی اس کے لئے گراں ہوگی، ایک نقطہ سے ہی ظاہر ہوگا۔

تو عرض یہ کررہا تھا کہ خارج کا علم حاصل کرنے کے لئے وسائل ہیں۔ داخل کا علم خارج میں منعکس کرنے کے لئے جو وسائل ہیں وہ سب ناقص۔ اسی لئے وہ جو حاملانِ علم الٰہی تھے انہوں نے اظہار علم کے لئے کتابیں نہیں لکھیں۔ انہوں نے اظہار علم کے لئے شاعری نہیں کی۔

جمال الٰہی کا ادراک مصطفٰیؐ سے زیادہ کسے ہوگا۔

مرتضٰیؑ سے زیادہ کسے ہوگا۔

زہرا وحسن وحسین علیہم السلام سے زیادہ کسے ہوگا جمال الٰہی کا ادراک؟

لیکن جمالیات الٰہیہ اور جمالیات فطرت کے اظہار کے لئے انہوں نے مصوری و نقاشی نہیں کی۔ کیوں کرتے اور کیسے کرتے؟ .... یہ جو خارج میں ہم لکھتے ہیں۔ کتابیں بھی فنا ہونے والی ہیں۔ پتھر کے مجسمے سنگ تراشی کر کے کتنے ہی حسین بنالیجئے ایک دن ان کا حُسن زائل ہوجائے گا۔ اور وہ نقاشیاں اور مرقّعے سب ختم ہوجائیں گے، پارہ پارہ ہوجائیں گے مگر یہ اظہار علم ایسا کرتے ہیں کہ کاغذ پر نہیں کیا کرتے قلم کے وسیلے سے نہیں کیا کرتے۔ جیسے ہم پتھروں کو پگھلا کر اپنے لئے ہوا پیا بناتے ہیں یہ نفوس انسانی پر تصرف کر کے سلمانؓ بناتے ہیں، ابوذرؓ بناتے ہیں، حرؓ بناتے ہیں، حبیبؓ بناتے ہیں، زہیرؓ بناتے ہیں۔

سب سے بڑا کام اس کائنات میں انسان سازی کا ہے۔ انسان بناؤ۔ روبوٹ نہ بناؤ۔ انسان بنانے والی فیکٹری آج تک نہ بن سکی۔ اور ایک وہ جو اُدھر سے علم لے کر آنے والے تھے انہوں نے علم کا اظہار کیسے کیا؟ علم کا اظہار نفوسِ انسانی پر کیا۔ دوسری چیزوں پر ہوا مگر کم۔ اس لئے کہ دائرہ کار تو سمجھو۔ ہمارا دائرہ کار یہ کہ پتھر کو پگھلائیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم لوہے سے کھیلیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ہواؤں سے الجھیں۔ یہ ہمارا کام ہے۔ یہ کسی نبی کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ رسول کے شایان شان نہیں ہے، یہ

امام کے شایانِ شان نہیں ہے۔ کبھی جب مطالبہ کرو گے، جب اسے عاجز سمجھو گے تو وہ معجزہ دکھا کر تمہیں عاجز کر دے گا۔ مگر اس کا کام نہیں ہے کہ لوہے کو پگھلاتا رہے ہمیشہ، وہ تو دلوں کو پگھلاتا ہے، وہ تو انسانوں کے پیکر ڈھالتا ہے وہ تو روحِ بشری کو سجاتا سنوارتا ہے، وہ غلام کو آزاد کرتا ہے وہ بلالؓ کو مؤذن بناتا ہے۔

نبی یا امام کا علم جب خارج میں آتا ہے تو کتابیں نہیں لکھی جاتیں، انسان ڈھالے جاتے ہیں۔ دستِ ادب جوڑ کے عرض کر رہا ہوں سوءِ تفاہم نہ پیدا ہونے پائے تقریر خاکی اور خاطی انسانوں کی تو غلطیوں سے پر ہوتی ہی ہے لیکن معصوم پیکروں کی تقریر ایسی ہوتی ہے کہ بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حضورؐ کی شان یہ تھی کہ زیادہ گفتگو نہیں کیا کرتے تھے۔ خاموش رہتے تھے۔ جب چشم رحمت کسی پر اٹھ گئی اس کی قسمت بدل گئی۔ کسی پر دستِ شفقت کا سایہ پڑ گیا سلمانؓ بن گیا۔ کسی کو باظرف سمجھا ایک دو کلمہ ارشاد فرما دیا۔ قیامت ہوگئی۔ اعطیت جوامع الکلم o مجھے مختصر گفتگو کرنے کا ہنر دیا گیا ہے لیکن یہ انسان کی کم ظرفیاں اور کوتاہ اندیشیاں اور نارسائیاں .... یہ بھی ہوا ہے کہ حضورؐ کا خطبہ سننے کے بعد باہر نکلے اور کہا:

ماذا قال آنفاً o یہ کیا کہہ رہے تھے۔ (قران نے تذکرہ کیا ہے)۔

جو حضورؐ کے بیان کو نہ سمجھ سکے یا سن کر غفلت سے اس طرح پوچھیں کیا کہہ رہے تھے؟ تھے تو رسولؐ کے قریب لیکن کیا انہیں رسولؐ کے صحابی کہیں گے آپ؟ کیا رسولؐ کا قدرداں سمجھیں گے آپ؟

اور کچھ وہ تھے جو فاصلے پر تھے۔ یمن میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر تصرفِ نفسِ مصطفےٰؐ یہ ہے، اس کا پیکر ایسا نکہت بار ہے کہ یمن سے جو ہوا آتی ہے وہ بھی خوشبو لئے ہوئے آتی ہے۔ یہ ہے باطن کا علم۔ جب خارج میں تصرف کرتا ہے تو یہ ہوتا ہے۔ اور جہاں جہاں آپ دیکھیں گے کہ جو منصب دارانِ الٰہی ہیں وہ کتابیں لکھنے میں interested نہیں رہے، شاعری میں interested نہیں رہے۔

وہ انسان ڈھالنے میں interested تھے، وہ آئے تھے انسان ڈھالنے کے لئے۔ اور اس کارخانۂ ہستی میں سب سے بڑا کام ہے انسان بنانا۔

مصطفیٰؐ نے انسان بنائے۔

مرتضیٰؑ نے انسان بنائے۔

حسنِ مجتبیٰؑ نے انسان بنائے اور.........

حسینؑ نے انسان بنائے اور کیا کیا انسان بنائے۔ اللہ اکبر!

گفتگو کو ادھوری چھوڑ کر منتقل ہو رہا ہوں۔ ہاں عالمِ فطرتِ ظاہری کا بھی مطالعہ کریں۔ عالمِ فطرتِ باطنی کا بھی مطالعہ کریں۔ خارج میں جو علم بکھرا ہوا ہے اسے سمیٹیں، داخل میں جو علم ہے اسے سنبھالیں۔ داخل و خارج میں وحدت قائم کریں، انطباق قائم کریں، مطابقت کریں۔ توحید کا درس حاصل کریں۔ توحید کا درس آفاق میں بھی ہے انفاس میں بھی ہے۔ سورۃ السجدہ کی ۵۳ ویں آیت ہے۔

سنریهم ایاتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق○

ہم عنقریب انہیں آفاق میں، کائنات میں، آسمانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے اور ان کے نفسوں میں نشانیاں دکھائیں گے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔ وہ خدا جو وجود رکھتا ہے وہ برحق ہے۔

میں ایک چیز عرض کرنا چاہتا ہوں دوسری آیتوں کی مدد سے مگر اب وقت نہیں ہے۔ دیکھئے آفاق میں بھی آیات الٰہیہ ہیں، خارجی کائنات میں خدا کی نشانیاں ہیں۔ نفس انسانی کے اندر خدا کی نشانیاں ہیں اور دامنِ تاریخ میں بھی خدا کی نشانیاں ہیں۔ واقعات بھی آیات الٰہی بن جاتے ہیں۔ روش و رفتارِ تاریخ میں اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں خدا کے وجود کا احساس کریں۔ مولائے کائنات نے اپنے لئے نہیں کہا تھا۔ انسان کو بیدار کر رہے تھے۔

عَرَفتُ ربی بفسخ العزائم○

میں نے اپنے رب کو پہچانا اپنے عزائم کے ٹوٹنے سے۔

یعنی تم کچھ کرنا چاہ رہے ہو نہیں کر پار ہے ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مطلقاً فاعلِ مختار نہیں ہو۔ مطلق العنان نہیں ہو۔ کوئی اور ہے جو مدبّرِ کائنات ہے۔ واقعات بھی آیات الٰہی بن جاتے ہیں۔ اللہ کی نشانیاں بن جاتے ہیں اور اس کائنات میں جو واقعہ سب سے بڑا آیت الٰہی کی حیثیت رکھتا ہے، سب سے بڑی آیت الٰہی بن کر جو واقعہ سامنے آیا وہ واقعہ کربلا ہے۔

کربلا جس کے سامنے ہو وہ توحید کا انکار کرسکتا ہے نہ نبوت کا انکار کرسکتا ہے، نہ آخرت کا انکار کرسکتا ہے۔ وہ دین کا انکار نہیں کرسکتا ہے جس کا رخ کربلا کی طرف ہوجائے سمجھو کہ اس کا رخ دین کی طرف ہوگیا۔ اسی لئے تو اس منبر سے اس آیت کی تلاوت کررہا ہوں۔

فاقم وجهك للدين اپنا رخ دین کی طرف کرلو۔

اور دین نظر نہ آئے تو اپنا رخ کربلا کی طرف کرلو۔

ایک بہت بڑے مفکّر نے کہا میں نام نہیں لوں گا۔ مشکلات کا زمانہ تھا، مسلمانوں کے یہاں کب مشکلیں نہیں ہوتیں۔ ہم اپنی بنائی ہوئی مشکلوں میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں مگر انہوں نے عام مجلس میں کہا، بزم عام میں کہا، حالانکہ ان سے توقع نہیں تھی۔ عجیب جملہ کہہ گئے۔ فرمایا: مسلمانوں کے لئے اب وقت کی ضرورت یہ ہے کہ کوفہ کی طرف نہ دیکھیں کربلا کی طرف دیکھیں۔

کربلا کی طرف جانے والا جارہا ہے۔ کہاں سے جارہا ہے؟ مدینۃ الرسولؐ سے جارہا ہے۔ مدینہ سے سبط رسولؐ جارہا ہے۔ سبط نبیؐ نکل رہے ہیں۔ کس انداز سے نکلے ہیں۔ کس طریقے سے نکلے ہیں، الامان الحفیظ تاریخ کے دل کا یہ ناسور ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوسکتا۔

جس روز حسینؑ نے مدینہ کو چھوڑا ہے ایسا شورِ گریہ بلند تھا کہ زمین تا آسمان پوری

فضا ستونِ گریہ بنی ہوئی تھی۔ ایک منارِ غم تھا جو قائم تھا۔ ذرہ ذرہ رو رہا تھا۔ در و دیوار رو رہے تھے۔ زن و مرد رو رہے تھے۔ اپنے پرائے رو رہے تھے۔ کوئی اور تھوڑی جا رہا تھا۔ مدینہ کی روح حسینؑ جا رہے تھے۔

اللہ آپ کی زندگیوں میں برکت عطا فرمائے۔ آپ کو حسینؑ کے غم میں رونے کی سعادت عطا فرمائے۔ روئیں، اشک عزا بہائیں اور تصور کریں۔ یہ روایتیں اگرچہ اصول دین اور فروع دین سے تعلق نہیں رکھتیں۔ اس لئے میں رجالِ سند سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لئے کہ روایت ممکن ہے راوی کے اعتبار سے ضعیف ہو مگر کیا واقعاتی اعتبار سے ناممکن ہے؟........

نہیں ممکن ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا ہوں۔

بعض کتابوں میں ہے حسینؑ جب چل رہے تھے سب کو ساتھ لیا، اکبرؑ کو ساتھ لیا، عباسؑ کو ساتھ لیا، قاسمؑ کو ساتھ لیا، زینبؑ کو ساتھ لیا۔ ام کلثومؑ کو ساتھ لیا، گھر کی کنیز فضہؓ کو ساتھ لیا۔ مگر ایک بچی تھی جس کا نام فاطمہ صغریٰ کہا جاتا ہے۔ ارے وہ بیمار تھی۔ بابا کے ساتھ جانے کی قدرت نہیں رکھتی تھی، توانائی نہیں رکھتی تھی۔ باپ نے سینے پر پتھر رکھا۔ بیٹی کو تسلی دی۔ بیٹا میں ساتھ لے کر چل نہیں سکتا۔ نانی کے ساتھ رہو۔ ام سلمہؓ کے سپرد کیا۔

قافلہ روانہ ہوا۔ سب سوار ہو گئے۔ کیا شان تھی سوار ہونے کی۔ زینبؑ کو عباسؑ نے سوار کیا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟ لجام فرس پکڑنے والے جہاں اکبرؑ ہوں، رکاب تھامنے والے جہاں قاسمؑ ہوں۔ بیبیاں سوار ہو گئیں۔

قافلہ ڈیوڑھی سے آگے بڑھا اور وہ بیمار بچی ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔ حسرت سے باپ کو دیکھ رہی ہے، ماں، پھوپھیوں کو دیکھ رہی ہے۔ ایک مرتبہ بیمار بچی سے رہا نہ گیا۔ قدم ڈیوڑھی سے باہر آ گئے لڑکھڑاتے ہوئے قدم آگے آ گئے۔

باپ نے دیکھا قافلہ روکا۔ پھر آئے سینے سے لگایا: بیٹا صبر کرو۔

بیٹی کی ایک تمنا ہے: بابا ایک بار اور مل لوں۔ ایک بار اور دست بوسی کرلوں اور ایک بار اور قدم بوسی کرلوں۔ بیٹی آئی۔ سب سے رخصت ہوئی، ننھا ایک شیر خوار ہے۔ شیر خوار کو کلیجے سے لگایا۔

اب حسینؑ چاہتے ہیں قافلہ آگے بڑھے۔ ماں ربابؓ آگے بڑھی، بیٹا اصغر میرے پاس آجا، اصغر نے ماں کو دیکھا بہن سے لپٹ گئے۔ زینبؑ آئیں، سکینہؑ آئیں، سارا کنبہ آیا۔ مگر اصغر، صغریٰ کی آغوش نہیں چھوڑتے!

ایک مرتبہ حسینؑ آگے بڑھے اور آنے کے بعد...... بیٹے کے قریب آکر کچھ فرمایا۔ اصغر ہمک کر باپ کی آغوش میں آگئے۔

سننے والا کوئی نہ تھا جو حسینؑ کا جملہ سنتا۔ مگر ادا شناس عصمت سمجھا۔

حسینؑ نے یہی تو کہا ہوگا۔ بیٹا تمہارا نام محضرِ شہادت میں موجود ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ٥ رضا بقضائہ وتسلیماً لامرہ۔

مجلس دوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! کل میں نے تقریر کے بالکل شروع میں ایک فقرہ عرض کیا تھا کہ تفسیرِ فطرت کا مدرسہ کھل گیا۔ دیکھئے مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے سامنے جو مجمع ہے اس میں بعض بہت دانش مند اور دانشور حضرات ہیں۔ بعض وہ حضرات ہیں کہ جن کا سروکار ہی روز وشب علم و دانش سے ہے، کتاب وقلم سے ہے، حرف ومعنی سے ہے اور ان کے لئے ایک کلمہ کافی ہوتا ہے۔ میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی کی طبیعت میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے بھی کبھی کبھی کسی تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں ہوتی ایک کلمہ کافی ہوتا ہے۔ ایک مختصر گفتگو زہیرؑ کو اُس طرف سے اِس طرف لے آئی۔

اتنا بڑا فاصلہ طے کیا ہے آپ نے۔ اندازہ ہے آپ کو؟ آپ زمینی فاصلوں پر نظر نہ رکھا کریں۔ زمینی فاصلے، فاصلے نہیں ہوا کرتے۔ اصل فاصلے وہ ہوتے ہیں جو ذہنوں

کے فاصلے ہوتے ہیں، جو عقیدوں کے فاصلے ہوتے ہیں، جو نظریوں کے فاصلے ہوتے ہیں۔ وہ فاصلے اتنے اور ایسے ہوتے ہیں کہ بہشت و دوزخ کے درمیان کے فاصلے کم پڑ جاتے ہیں۔ کہاں تھے زہیر ابن قینؒ اور ایک مختصر گفتگو کے بعد کہاں آ گئے۔ کہاں تھے حرؒ اور کہاں آ گئے۔

حرؒ سے امام حسین علیہ السلام کی گفتگوئیں اتنی زیادہ نہیں ہوئیں جتنی بالقصد وبالارادہ عمر ابن سعد سے گفتگوئیں کی ہیں امام نے۔ تاریخ کربلا پر نظر ہے؟ بالقصد، بالارادہ، امامِ معصومؑ، فرزندِ رسولؐ، سبطِ نبیؐ بلا رہے ہیں۔

سن لے میری بات، سمجھ تو لے کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے تیری ضرورت نہیں ہے، تجھے میری احتیاج ہے۔

مگر سمجھ میں نہ آئی۔

تو عزیزو! یہ بر سبیل تذکرہ اور بطور مثال میں نے عرض کیا۔ کہ کبھی طبیعتوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ایک جملہ، ایک کلمہ کافی ہوتا ہے۔ لیکن کبھی جب گفتگو بہ تکرار ہو، جب جملہ مکرّر عرض کیا جائے، جب مثال کو دہرایا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہماری نظر ان پر بھی ہے جن کا سروکار روز و شب علم و دانش سے نہیں ہے۔ جو زندگی کی رزم گاہ میں زندگی کے کارزار میں مسلسل محنت کر رہے ہیں، مزدوری کر رہے ہیں اور وہ کسبِ حلال اور رزقِ حلال کی تلاش میں ہیں۔ کبھی کبھی ان کو سمجھانے کے لئے آپ سب کو تجربہ ہوگا کہ ایک جملہ، ایک کلمہ، ایک لفظ، ایک معنی ذہن نشین و دل نشین بنانے کے لئے بہت سعی و کوشش کرنی پڑتی ہے۔ بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی بات پر زور دینے کے لئے اگر کوئی بات مکرر عرض کروں اور کسی کی طبیعت پر گراں گزرے تو وہ اپنی طبیعت کی لطافت سے مجھے بحل فرما دے۔

عرض کیا تھا کہ یہ تفسیرِ فطرت کا مدرسہ ہے اور خدا کی قسم یہاں تفسیرِ فطرت نہ ہوگی تو کہاں ہوگی۔ اس تفسیر کے لئے اور اس بحث کے لئے جو لازمی مقدمہ تھا وہ کل گزارش

کر چکا۔ اور یہ کوئی میری دانشورانہ انانیت نہیں بول رہی ہے۔ انتہائی طالبِ علمانہ انکسار و عاجزی سے عرض کر رہا ہوں کہ ممکن ہے جو مطالب، کل گزارش کئے وہ مسلسل تفکر کے بعد زیادہ سے زیادہ ثمرات دے سکیں!

میں نے گزارش کی تھی کہ علم کا قدم بہرحال درمیان میں ہونا ضروری ہے مگر جسے دنیا علم سمجھتی ہے وہ علم نہیں ہے۔ علم تو وہ جوہر ہے جس میں جہل کا، نادانی کا، شک کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ اب بتایئے کہ اگر سائنس کی دنیا سے آج کوئی تھیوری سامنے آئی اور بیس برس کے بعد تبدیل ہوگئی تو پہلی تھیوری کو علم کا نام دیں گے یا دوسری کو۔ جب کہ دوسری پر بھی یقین نہیں ہے کہ یہ اگلے دس بارہ برسوں میں تبدیل نہ ہوگی۔

علم تو وہ ہے جس میں شک کا دخل نہ ہو، علم تو وہ ہے جس میں جہل کا دخل نہ ہو، علم تو وہ ہے جس میں نادانی کا کوئی عنصر نہ ہو، علم تو وہ ہے جس میں اشتباہ کو راہ نہ ہو، اس لئے مجتہد اور فقیہ اور عالم کا علم بھی علم نہیں کہلاتا۔ علم صرف قول معصوم ہے۔

ہم جہاں جہاں علم کا اطلاق کرتے ہیں چاہے وہ scientist کا ہو یا فقیہ کا، مجاز ہے۔ سب مجاز، حقیقت میں تو علم وہ ہے جو قال اللہ یا قال رسول اللہ ہو۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ تعصب ہے کہ scientist کا علم، علم نہیں ہے، فقیہ کا علم، علم ہوتا ہے۔ نہیں۔ فقیہ کا فتویٰ بھی بدلتا ہے اسی طرح سے جس طرح scientist کی تھیوری۔ قال اللہ کبھی بدلنے والا نہیں ہے۔

دانشورو!........ علم طلبو! اگر علم کی طلب ہے تو قال اللہ کی تلاش کرو۔

ماقال الله کو سمجھو۔ کیا کہا پروردگار نے...... مگر کس سے سمجھو گے؟ مسئلہ تو یہی ہے کس سے سمجھیں کہ اللہ نے کیا کہا۔ الفاظ ان کی ڈکشنریوں میں جا کر تلاش کریں جو ماں کے پیٹ سے جاہل پیدا ہوئے یا اس فرہنگ سے تلاش کریں جنہوں نے پیدا ہوتے ہی قران کے معانی بیان کرنا شروع کر دیئے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے آپ کی فراست ایمانی کافی ہے اور میں کہتا ہوں کہ شہر

کراچی ایمانی فراست رکھنے والوں کا شہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ۔ جس شہر میں کثرت سے ذکر آل محمدؑ ہو اگر اسی شہر میں ذہانتیں پروان نہ چڑھیں گی تو کہاں پروان چڑھیں گی۔ یہ جو ذکر ہے نا یہ باران رحمت ہے، جو روحوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ شعور کو پروان چڑھاتا ہے، یہ ذہانتوں کو، فراستوں کو، عقلوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ شجر علم، بہشتِ بے آدمؑ میں نہیں ہے۔ شجر علم، بہشتِ ذکر آل محمدؑ میں پایا جاتا ہے۔

گفتگو کو پھر مربوط کریں کل کی گفتگو سے کہ علم جو کچھ آپ حاصل کرر ہے خارج سے ہے۔ مکرر کیوں عرض کررہا ہوں کہ کل کچھ حضرات نے داد دی، سمجھ میں آیا۔ کچھ حضرات نے کہا: کچھ اشتباہ باقی رہ گیا۔ یعنی میرے بار بار جملوں کے عرض کرنے کے باوجود اشتباہ باقی رہ گیا۔

جب تک چیزیں روحِ مجرّدِ انسانی میں منتقل نہ ہوجائیں انہیں علم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ جملہ دانشور کے لئے کافی ہے لیکن جس کا سروکار فلسفیانہ بحثوں سے نہیں ہے۔ اس کے لئے پھر مکرّر مثال عرض کرنی پڑے گی۔ کل میں نے مثال عرض کی کہ کسی نبی نے، کسی ولی نے کتاب تصنیف نہیں کی۔ لوگوں کو شبہ ہوا پھر نہج البلاغہ کیا ہے؟..........

آپ کیا سمجھتے ہیں ''نہج البلاغہ'' امیر المومنین علیہ السلام نے تصنیف فرمائی ہے؟ قلم کاغذ لے کر بیٹھ کر لکھی ہے یہ کتاب؟ علیؑ زکاۃ علم بانٹتے رہے، جس کی جھولی میں جتنا آ گیا۔

نہج البلاغہ تو رضی کے کشکول کا نام ہے، ظرفِ علمِ علیؑ کا نام نہیں۔ ہمارے اور آپ کے ساتویں امام، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل سے ہونے والے دو برداران سید مرتضٰی اور سید رضی کیا جلیل القدر افراد تھے۔ وقت نہیں ہے موقع نہیں ہے کہ ان کے فضائل بیان کروں۔ ایسے عظیم المرتبت افراد تھے۔

مشہور واقعہ ہے اشارہ کر کے آگے بڑھ جاؤں کہ علامہ مفید، جن کا لقب مفید بھی امام زمانہ علیہ السلام کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ

سیدہ طاہرہؑ تشریف لائی ہیں اور دونوں ہاتھوں میں حسنین علیہما السلام کی انگلیاں ہیں۔ ایک ہاتھ میں امام حسن علیہ السلام کی انگشت مبارک ہے ایک ہاتھ میں امام حسین علیہ السلام کی انگشت مبارک اور فرما رہی ہیں کہ مفید ذرا میرے ان بچوں کی تربیت کا خیال رکھنا۔ انہیں تعلیم دو۔ اٹھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ یہ کیا خواب ہے؟.........

مدرسہ میں تشریف لائے یعنی درس گاہ۔ جب درس دے چکے تو دیکھا وہ علویہ خاتون، وہ سیدہ آ رہی ہے جو رضی اور مرتضٰی کی والدہ گرامی ہے۔ رضی اور مرتضٰی کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے ہیں اور کہتی ہیں مفید میرے ان بچوں کی تعلیم کا انتظام کرو۔ یہ ہیں رضی اور مرتضٰی۔

رضی نے ایک کشکول بنائی، رضی نے ایک منصوبہ بنایا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی سوانح عمریاں لکھیں گے اور سوانح عمریوں کے ساتھ ائمہ کے اقوال کو جمع کریں گے۔ اور انہوں نے ''خصائص امیر المومنینؑ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ کچھ اقوال اس میں جمع کئے۔ پھر طبیعت سیراب نہ ہوئی۔ حدیث ہے اور یہ حدیث آپ کو سنا رہا ہوں تاکہ یاد رہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

منھومانِ لا یشبعان o دو پیاسے کبھی سیراب نہیں ہوتے۔

طالب علم و طالب مال o ایک وہ جو علم کا طلب گار اور پیاسا ہو۔ دوسرا وہ جو مال دنیا کا طلب گار اور پیاسا ہو۔

دونوں کی تشنگی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم کا طلب گار اگر اپنی طلب کی آسودگی حاصل کرتا چلا جائے تو اس کو عروج حاصل ہوتا رہتا ہے۔ مال دنیا کا طلبگار ''اسفل سافلین'' تک پہنچ جاتا ہے۔

تو رضی کی طبیعت کو سیری نہ ہوئی انہوں نے کہا مولا کے اور اقوال جمع کریں گے۔ اقوال جمع کئے، خطوط جمع کئے۔ چھوٹے چھوٹے جُملے اور گفتگوؤں کے ٹکڑے جمع کئے اور ان میں بھی انتخاب سے کام لیا یعنی پورے پورے خطبے جمع نہیں کئے، پورے پورے خطوط

جمع نہیں کیئے۔ چھوٹے چھوٹے اقوال جمع کر لئے اور اس کا نام ہے ''نہج البلاغہ''۔ یعنی نہج البلاغہ یقیناً مولائے کائنات کے اقوال کا مجموعہ ہے لیکن وہ کشکولِ رضی ہے، تصنیف علیؑ نہیں ہے۔

اشتباہ دور ہوگیا؟......... اب بتایئے یہ بات منبر سے کہنے کی تو نہیں تھی۔ اربابِ دانش کو تو معلوم ہے لیکن جن احباب نے صرف نہج البلاغہ کا نام سنا ہے اور وہ اسے قرانِ بلاغتِ علیؑ سمجھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ ہے، مگر انہیں یہ اشتباہ ہے کہ یہ آقا کی تصنیف ہے۔ آقا نے ''نہج البلاغہ'' تصنیف نہیں فرمائی۔

آقا کی تصنیف کا نام ہے سلمانؓ، آقا کی تصنیف کا نام ہے بوذرؓ،

علیؑ کی تصنیف کا نام ہے میثم۔

علیؑ کی تصنیف کا نام ہے حسینؑ، علیؑ کی تصنیف کا نام ہے حبیبؑ۔

خدا آپ کے پاکیزہ ایمان و عرفان کو اور برکت عطا فرمائے۔ کیا محبتیں ہیں آپ کی، میں فضائل پڑھ رہا ہوں آپ کی آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں۔ کسی کو سچے عشق کا تجربہ ہو تب نا جانے، مصیبتوں پر نہیں رویا جاتا، شجاع مصیبتوں پر نہیں روتے فضیلتوں کو حاصل کر کے خوشی میں بھی آنسو بہاتے ہیں۔ ان آنسوؤں کی تعریف دنیا والے نہیں جانتے۔ آنسوؤں کی قِسمیں نہیں جانتے۔ میں فضائل پڑھ رہا ہوں آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

کل ایک اور ایراد ہوا، اعتراض ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی مگر وہ اس سے بھی زیادہ کسی عزیز کے اشتباہ پر مبنی تھا۔ کہنے لگے کہ آپ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے کوئی تصنیف نہیں کی........ اس پر تو کسی کو بھی اشتباہ نہیں ہے۔'' ''تو پھر قران کیا ہے ؟'' ....

عزیزو! قران مصطفیٰ کو اللہ کی عطا کردہ کتاب ہے۔

پھر کہوں گا مصطفیٰؐ کی تصنیف کا نام ہے علیؑ،

مصطفیٰؐ کی تصنیف کا نام ہے حسنؑ،

مصطفیؐ کی تصنیف کا نام ہے حسینؑ،

مصطفیؐ کی تصنیف کا نام ہے زہراؑ۔

اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے تو عرض کیا تھا۔ کہ ان کے علم کا جب اظہار ہوتا ہے۔ جب داخل کا علم خارج میں آتا ہے تو تصنیفات کی شکل میں نہیں آتا تصرّفات کی شکل میں آتا ہے تصنیف اور تصرّف میں بہت فرق ہے۔

ایک سائنس کا طالب علم ہے جس نے تھیوریاں رٹ لیں۔ معمولی سا طالب علم ہے۔اس نے definitions,terminologies، زبان، الفاظ، تعریفات، نظریات رٹ لئے۔ جب یہ اور آگے بڑھا، علم پختہ ہوا تو اب اس میں تھوڑا سا تصرّف پیدا ہوا۔ یہ تصرّف کہاں تک جائے گا؟.........صرف اس کا تھوڑا سا علم بڑھا ہے تو اس کا تصرف صرف الفاظ تک رہے گا۔ یعنی یہ بات اس طرح کہی گئی ہے اگر اس طرح کہی جائے تو بہتر ہے۔تصرّف تو کیا مگر الفاظ میں۔

علم بڑھا، تصرّف بڑھا، قوتِ تصرّف پیدا ہوئی۔ لیکن تصرّف کہاں تک؟ الفاظ تک .... اور علم بڑھا تو ابھی الفاظ میں تصرّف کیا تھا، اب معنی میں تصرّف ہوا۔ یعنی صرف الفاظ کے ردوبدل کی بات نہیں ہے۔ اصلاً جو معنی بیان کئے گئے جو تعریف کی گئی۔ وہ جو سمجھ میں نہیں آئی۔ اس حقیقت کی تعریف اس طرح کی جائے تو بہتر ہے۔

واضح ہے۔علم بڑھا، تصرّف بڑھا۔ پہلے علم ذرا سا بڑھا تو الفاظ پہ تصرّف بڑھا۔ پھر علم اور بڑھا تو معنی پہ تصرّف بڑھا۔ اب علم اور زیادہ بڑھا تو لفظ و معنی سے بات حقیقت اشیاء تک پہنچی۔ جب علم بڑھتا گیا کمالِ علم پیدا ہوا تو کمال تصرّف یعنی صنعتوں کا وجود ہوا۔ یہ ہوائی جہاز بننے لگے، راکٹ بننے لگے۔ اور نازک سے نازک آلات بننے لگے جن سے آپ مریخ تک کی تصویر کشی کرلیں یا اپنے قلب کی تصویر کشی کرلیں یا زمین کی تہوں کی تصویر کشی کرلیں۔

آلات بننے لگے۔ علاج کے طریقے پیدا ہونے لگے۔ شعاعوں کو تقسیم کیا جانے لگا

یعنی اب تصرّف تو ہے مگر الفاظ پر صرف نہیں، لغات پر صرف نہیں، معانی پر صرف نہیں۔ علم بڑھتا گیا تصرّف بڑھتا گیا، اور جہاں علم کامل ہوگا؟.........اس کائنات میں سب سے مکمل مخلوق کون سی ہے خدا کی؟........

زمین؟...آسمان؟... پہاڑ؟... پتھر؟... دریا؟... سمندر؟...

سب سے کامل مخلوق انسان ہے۔ جس میں اختیار بھی ہے، جس میں ارادہ بھی ہے، جس میں شعور بھی ہے۔

آپ ایک پتھر کو اٹھا کر جہاں جی چاہے رکھ دیں۔ جہاں رکھیں گے اس پتھر کو رکھا رہے گا۔ ہر پتھر میں یہ شعور نہیں ہے کہ اٹھانے والے کے ہاتھوں کو پہچانے اور جب تک دستِ معصوم نہ آجائے اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔

ہیں......... کچھ پتھر ہیں........ اس سطحِ زمین پر تو بس ایک ہی پتھر ہے ایسا جسے ایسا شعور ہے کہ جب تک دستِ معصوم نہ آجائے اسے جنبش نہیں ہوتی۔ تاریخ پر نظر ہے نا!...... خانۂ کعبہ کی تجدید بناء ہورہی ہے اور سنگِ اسود رکھا ہوا ہے۔ تمام قبائلِ عرب جمع ہیں اور ممکن ہے کہ جنگ ہوجائے، خوں ریزی ہوجائے، اِس قبیلہ کا سردار اُٹھا کر نصب کرے گا یا اُس قبیلہ کا سردار اُٹھا کر نصب کرے گا۔ اور سنگ اسود وہیں رکھا ہوا ہے۔

بات یہاں تک آگئی ہے تو اسے روکتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ جہاں مدینۂ علم کی بات ہوگی وہاں پر اظہارِ تصرّف بھی کب سے شروع ہوگا اور کہاں تک ہوتا رہے گا کون بتا سکتا ہے؟ ارے کبھی غور کیا کہ مصطفیٰؐ کا سال ولادت عام الفیل کیوں ہے؟ جس سال ابرہہ کا لشکر تباہ ہوا اسی سال مصطفیٰؐ کی ولادت چند روز کے بعد ہوئی۔ یعنی ابھی توحید کا معلّم آخر آیا نہیں ہے مگر اس کے وجود کا جلال ظاہر ہونا شروع ہوگیا۔

عام الفیل رسولؐ کے سال ولادت کو کہتے ہیں کیونکہ اسی سال مشرک فوج نے توحید کے مرکز کو نابود کرنا چاہا، کیسا تصرّف سامنے آیا؟........

مصطفیٰؐ آنے والے ہیں آئے نہیں۔ کعبہ ہی کے تعلق سے یہ تصرّف سامنے آیا

کہ کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے جو فوج آئی اسے ابابیل نے آ کر تباہ کر دیا۔ مرکزِ توحید باقی رہا۔ جو شان مصطفیٰؐ کی وہی نفسِ مصطفیٰؐ کی۔

مصطفیٰؐ کے آنے سے پہلے آثار جلالِ مصطفیٰؐ سامنے آنے لگے اسی طرح مرتضیٰؑ کے آنے سے پہلے جلال مرتضیٰؑ سامنے آنے لگا۔ ابھی تین دن بعد ولادت ہوگی مگر دیوار میں شق آج پیدا ہوگیا۔ یہ تصرّف ہے۔ علم کی قوت ظاہر ہو رہی ہے۔ مدینۃ العلم آ رہا ہے کوئی اور نہیں۔ کیونکہ وہ آ رہا ہے اس لئے خانۂ کعبہ گر نہیں سکتا اور جب وہ آ چکا ہے تو خانۂ کعبہ بغیر اس کے ہاتھ لگائے بن نہیں سکتا۔

آپؐ مکہ میں تشریف فرما ہیں۔ سیلاب آیا (کعبہ) گر گیا۔ ابرہہ کا لشکر بھی جسے نہ گرا سکا تھا وہ سیلاب سے گر گیا۔ اُس وقت بچانے والے نے بچایا۔ ابرہہ کے لشکر سے بچانے والا خدا سیلاب سے کیوں نہ بچا سکا؟ بچانے کی قدرت رکھتا تھا مگر کعبہ کے جلال کے اظہار کا موقع نہ تھا مصطفیٰؐ کے جمال کے اظہار کا موقع تھا۔

ابرہہ کا لشکر آیا خانۂ کعبہ کو گرانے کے لئے قدرتِ خدا کو جوش آ گیا۔ پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ سیلاب آیا........ مکہ میں بھی سیلاب آتا ہے !........ مکہ اور سیلاب! اور ایسا سیلاب!

دیکھئے یہ وہی منزل ہے کہ صحرا میں سنگ ریزے پڑے رہتے ہیں، ببول کے کانٹے اُگے رہتے ہیں۔ عام گزرنے والے کانٹوں سے دامن بچاتے ہوئے، پتھروں کی ٹھوکروں سے بچتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اپنے قدم کی سلامتی اور اپنی سلامت روی پر ناز کرتے ہیں، لیکن جب کوئی آرٹسٹ گزرتا ہے، کوئی باذوق گزرتا ہے کچھ شعورِ جمالِ فطرت رکھنے والا گزرتا ہے تو ایک ایک کانٹا دامن کو کھینچتا ہے اور وہ دامن چھڑاتا نہیں۔ کانٹے کے حسن کو دیکھتا ہے۔ ایک ایک پتھر کی زیبائی کو دیکھتا ہے۔ یہ تخلیق کیسی ہے؟ کس کی ہے؟....... ہر ذرہ کا اپنی جگہ ایک الگ حسن ہے، ایک الگ جمال ہے، ایک الگ جلال ہے، ایک الگ وجود ہے۔ ایک الگ پیغام ہے اس میں، ایک الگ زبان ہے اس کی۔

گزرنے والے دوانسان یکساں طور پر تعامل نہیں کرتے اسی طرح تاریخ کے حوادث ہیں۔ ایک شخص سیلاب سمجھتا ہے ایک شخص اسے آیت الٰہی سمجھتا ہے۔

سیلاب ہے، دیواریں گر گئیں کعبہ کی، حجر اسود رکھا رہا۔ جب مصطفیٰؐ آئے تو ہاتھوں میں اٹھا کر حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ اب ذہن مربوط ہو گیا آپ کا؟........ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟........ یہ تصرّف ظاہر ہو رہا ہے۔

تصرّفِ علمِ الٰہی ،تصرّف ظرفِ علمِ الٰہی۔ مصطفیٰؐ ظرفِ علمِ الٰہی کا نام ہے!

ان کی ذات میں جو علم ہے وہ جب ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات کل بھی عرض کی تھی اور آج بھی عرض کر رہا ہوں۔ کل ایک جملہ کہہ کے گزر گیا تھا کہ عام انسان تصرّف کرتا ہے جمادات پر، نباتات پر، ہواؤں پر، اس کا علم ناقص ہے۔ اور سب سے کامل جو مخلوق اس کائنات میں ہے وہ ہے انسان۔ تو جس کا علم سب سے مکمل ہوگا اس کا تصرّف کس پر ہوگا؟........

ہر شے پر تصرّف آسان ہے الاّ انسان۔

لوہے کو آپ پگھلا کے جس سانچے میں ڈھال دیں گے ڈھلا رہے گا، پتھر کی جیسی مورت بنا دیں گے بنی رہے گی، جہاں اٹھا کر رکھ دیں گے رکھا رہے گا۔ مگر انسان جس میں کہ شعور اور ارادہ ہے اس پر تصرّف بہت دشوار ہے۔ جس کا علم سب سے زیادہ ہوگا، وہی انسان پر تصرّف کر سکے گا۔ اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ سائنسدانوں کی دنیا اور ان کا تصرّف ہے جمادات و نباتات اور عناصرِ دنیا پر مگر جو اللہ نے علم کے پیکر بھیجے ان کا تصرّف انسانوں پر ہے۔

اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں میں نے کہا کہ یہ کتاب وقلم لے کر تصنیف تھوڑی کرتے ہیں؟........قران عطائے پروردگار ہے، عطائے رب ہے، پھر عرض کروں خدا نے اپنے مصطفیٰؐ سے کیسا کام لیا ہے؟........سیرتِ مصطفیٰؐ پر غور کرنے والے، حضورؐ کے نام لیوا اس پر غور تو کریں۔ مقام ادب ہے، کہتے ہوئے

مجھے ایک عجیب فکری مرحلے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ دیکھئے اللہ نے بہت مشکل کام سپرد کیا تھا اپنے انبیاء و مرسلین و ائمہ و اوصیاء کو۔ مشکل ترین کام۔

اپنی زندگیوں سے مربوط کریں اس بحث کو۔ روزی، روٹی کمانا آسان ہے۔ بہت آسان ہے مشکل نہیں ہے ہر چند کہ آپ اس کو بہت بڑی مشکل سمجھتے ہیں۔ پھر بھی پیسے کمانا بہت آسان ہے اس دنیا میں لیکن ایک لائق بیٹے کی تربیت کرنا (بہت مشکل ہے)۔ ٹیوٹر پر ٹیوٹر رکھ دیجئے، اچھے کالج میں بھیج دیجئے، گھر کے تمام وسائل اور آلات اور instrument سب جمع کر دیجئے۔ گھر کو کتب خانہ اور لیباریٹری بنا دیجئے، پیسوں کی کمی نہیں ہے پھر بھی کوئی گارنٹی ہے کہ وہ لائق بیٹا پیدا ہوگا؟........کوئی ہے ضمانت؟........ پیسہ کمانا بہت آسان، ایک لائق بیٹے کی تربیت بہت مشکل۔

یہ پیغام ہے یا نہیں؟........ یہ نہ سمجھئے گا کہ منبر سے پیغام نہیں ملتا۔ منبروں کے ہی تو پیغاموں نے انسانیت کی آبرو رکھ لی ہے۔

ایک لائق بیٹے کی تربیت سب سے مشکل کام ہے اس دنیا میں۔ آپ کے تجربے کی بات کر رہا ہوں، اپنے تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ہر کام آسان ہے مگر ایک انسان کی تربیت مشکل۔ اب سمجھئے، اس سے آگے بڑھ کر۔ قانون بنانا۔ پارلیمنٹ میں قانون کیسے بنتے رہتے ہیں؟ ماشاء اللہ جو حکمراں آیا قانون بنانے میں کیا ہے؟ آنکھیں بند کیں dictation شروع کر دیا۔ اور جب قانون بن گیا تو اس قانون پر خود عمل کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ جب چاہے صلح کا قانون پاس کر لیجئے، جب چاہے جنگ کی تجویز پاس کر لیجئے۔ جو جی چاہے کر لیجئے۔ کبھی تخفیف اسلحہ کی بات کر لیجئے۔ اِدھر تخفیف اسلحہ کی بات ہوئی اُدھر اسلحہ کی نمائش ہونے لگی۔ اِدھر امن کی بات ہوئی اُدھر فوج کشی ہونے لگی۔ تو قانون بنایا اور خود عمل نہ کر سکے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔

قانون بنا دینا آسان ہے۔ (انسانی سطح پر اب گفتگو کر رہا ہوں)۔ قانون بنا دینا

بہت آسان ہے اور قانون پر خود عمل کرنا بہت دشوار ہے اور دوسروں سے عمل کرانا اس سے زیادہ دشوار۔ اور پھر ایسے افراد بنا دینا جو قانون کی بغیر کسی خوف و حرص کے کبھی خلاف ورزی نہ کریں؟ ارے بھئی دنیا میں ہے کہ قانون بنایا اور جو اس قانون کو توڑے اس کے لئے سزا ہے۔
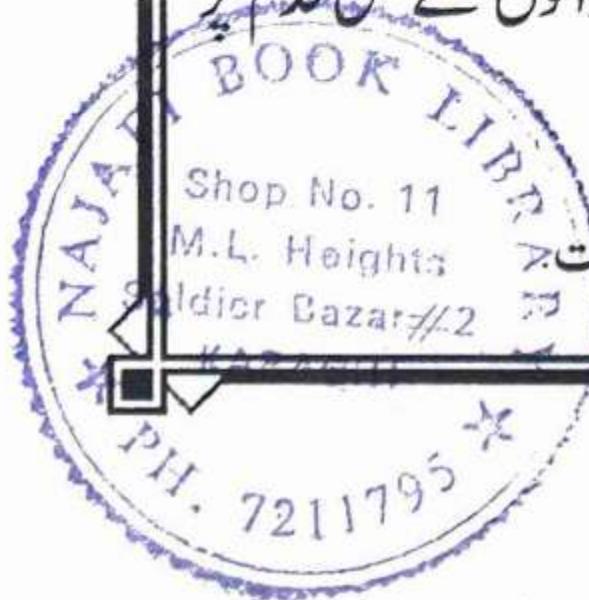
یہ دنیا کا تجربہ!........ خداوند کریم کے یہاں کیا ہے کہ اگر قانون کی خلاف ورزی کیجئے گا تو جہنم۔ قانون کی پابندی کیجئے گا تو بہشت۔ مگر اس کے علاوہ پروردگار نے ایسے افراد بھی بنائے کہ جو یہ کہیں کہ ہم اس کی اطاعت، اس کی عبادت، اس کی بندگی جہنم کے ڈر سے یا جنت کے لالچ سے نہیں کرتے۔ اس نے بنائے ایسے افراد اور اس کے بعد دنیا میں بھیجے۔

اب ایک اہم مرحلہ۔ اس نے ایسے افراد بنائے اور دنیا میں بھیجے۔ انبیاء، ائمہ، مرسلین، اوصیاء یہ سب اس نے بھیجے۔ یہ سب وہ مقرّر فرماتا ہے اور کتاب نازل کردی۔ اب ایک مقام تھا حدِ ادب کا، میں نے مثال کیوں دی تھی؟.... کتاب نازل کر دینا آسان ہے کتاب پر عمل کرانا بہت مشکل ہے۔ کتاب نازل کردی پروردگار نے، عمل کرانے کی مشکل ترین ذمہ داری مصطفےٰ کو دی گئی، انبیاء کو دی گئی، مرسلین کو سونپی گئی۔

ہمارے یہاں ایک اصطلاح اور ہے۔ اور آپ ہماری اصطلاح سے اختلاف کر لیجئے مگر تاریخ سے کیسے اختلاف کیجئے گا۔ معصوم تو وہ ہیں جنہیں اللہ نے بے خطا بنایا۔ ہماری نظر میں ایسے افراد بھی ہیں جنہیں انہوں نے اپنے آغوش تربیت میں پالا اور وہ ایسے بنے کہ زندگی میں کبھی کوئی خطا نہ ہوئی۔ جنہیں ہم کہتے ہیں محفوظ عن الخطاء۔

معصوم الگ، محفوظ عن الخطاء الگ۔ معصوم وہ ہے جو وہاں سے علم لے کر آئے اور علم پر عمل کی توانائی لے کر آئے۔ محفوظ وہ ہے جو وہاں سے آنے والوں کے نقش قدم پر چلے اور پھر اس کو سند مل جائے۔

سلمانُ مِنّا اهل البیت ○ ابوذر مِنّا اهل البیت

ہر ایک کو اہل بیت میں شامل ہونے کی یا مِنّیت کی سند نہیں ملتی، جو محفوظ عن الخطاء ہو جائے اسے یہ سند ملتی ہے۔

میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف روایتیں سنا کے آگے نہ بڑھ جاؤں۔ اس میں جو منطقی اور وجودی حقیقت ہے وہ بھی سامنے آتی چلی جائے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ سخن گسترانہ باتیں تھیں۔ حضورؐ بھی بشر تھے۔ محبت میں کہہ دیا۔ وہ محبت میں ایسے نہیں کہتے تھے جیسے شاعر کہتے ہیں۔ اسی لئے پروردگار نے فرمایا سورۂ مبارکہ یٰسین میں:

وما علمنٰه الشعر وما ینبغی لهٗ ط (آیت ٦٩) ہم نے اپنے حبیب کو شاعری نہیں سکھائی۔

یہ ان کے لئے ضروری نہیں ہے۔ یہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ پیغمبر یوں ہی شاعری نہیں کرتے، جب کہہ دیں سلمان مِنّا اهل البیتo

اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انہیں دیکھ کر سمجھو کہ پیغمبر نے کیسا حق رسالت ادا کیا ہے۔ انسان سازی کا کام کیا یا نہیں کیا؟

قانون سنا دینا اوروں کا کام ہوگا۔ قانون کے سانچوں میں پیکروں کو ڈھال دینا مصطفٰےؐ کا کام ہے۔ پھر جملہ دہراؤں اس کائنات کا سب سے بڑا کام، انسان سازی کا کام ہے۔ انسان خود کو بنائے، انسان اپنے گھر کو بنائے، انسان اپنے معاشرے کو بنائے۔ جب خود کو بنائے گا گھر خود بخود بنتا چلا جائے گا۔ جب ایک گھر بن جائے تو ہمسائے خود بخود بننے لگیں گے۔ جب ایک محلّہ تعمیر ہو جائے گا تو پھر تمدن وہ خوشبو ہے جو سمٹ کر نہیں رہتی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان سالم بنیادوں پر انسان سازی میں مشغول ہو جائے۔

کام بہت مشکل ہے۔ خود کو بھی بنانا مشکل ہے۔ دوسروں کو بنانا بھی مشکل ہے۔ لیکن اس مشکل سے گزرا جا سکتا ہے۔ انہی کی سیرتوں کو دیکھ کر، انہی کی صورتوں کو دیکھ کر، ان ہی کے اقوال کو سن کر، انہی کے افعال پر عمل کر کے، انہی کا اتباع کر کے اس مشکل

سے گزرا جاسکتا ہے۔

گفتگو کو ایک مرحلہ اور آگے بڑھادوں۔ ابھی تک کل کے اشتباہات کو دور کرنے کی باتیں ہورہی تھیں۔ کہ میں نے کیا کہا، کیوں کہا۔

''نہج البلاغہ'' علیؑ کی تصنیف نہیں ہے، کشکول رضی کا نام ہے۔ ''نہج البلاغہ'' جیسی ابھی کتنی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔

''نہج البلاغہ'' ایک محدود کتاب کا نام ہے۔ علیؑ ایک لامحدود علم کے دروازے کا نام ہے۔

فطرت کے تعلق سے یہ بات ہورہی تھی کہ فطرت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے علم کا قدم درمیان میں ضروری ہے۔ بات یہاں تک آگئی۔ اسی ''نہج البلاغہ'' کا ایک جملہ سنئے۔ اور دیکھئے ایک فقرہ ''نہج البلاغہ'' کا اتنی گہری معنویت رکھتا ہے۔ اور جب ''نہج البلاغہ'' کے فقروں میں ایسی معنویت ہے تو قران میں کیسی معنویت ہوگی۔ فطرت کی تعریف میں تلاش کررہا تھا، ''نہج البلاغہ'' کے اس جملے پر نظر پڑی۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ ارشاد فرماتے ہیں:

كلمة الاخلاص هي الفطرة٥

''نہج البلاغہ'' کا ایک چھوٹا سا خطبہ ہے اس خطبہ کا ایک فقرہ سنا رہا ہوں۔

كلمة الاخلاص هي الفطرة ٥ کلمہ اخلاص کسے کہتے ہیں؟.......

کلمہ لا اله الا الله٥ کلمۂ اخلاص کلمہ توحید ہے۔ لا اله الا الله یہ ہے فطرت۔

اب یہ دیکھئے، کیسی پریشان نظری کا موقع ہے۔ ہم سمجھتے رہے کہ فطرت نام ہے پہاڑوں کا، دریاؤں کا، ہواؤں کا، جنگلوں کا، سمندروں کا، باغات کا، فطرت نام ہے، انسان کی خارجی اور داخلی دنیا کا۔ یہ ہمارا علم ہے۔

(توجہ رکھئے گا ان شاء اللہ ذہن محظوظ ہوگا)۔

ہمارا علم یہ جو خارج سے عکس پذیر ہوتا ہے۔ ہمارے علم اور معلومات کی نقش بندی

خارج کے ناقص مناظر کرتے ہیں۔ یہ علم کہتا ہے کہ نیچر، فطرت، یہ پھیلی ہوئی کائنات ہے۔ ذرہ ذرہ بکھرتا ہوا دامنِ مکان اور لمحہ لمحہ نابود ہوتا ہوا تختِ زمان۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مکان و زمان کی دنیا یہ فطرت ہے۔ سورج، چاند، ستارے یہ سب نیچر۔علیؑ کیا کہہ رہے ہیں کلمة الاخلاص هی الفطرةo

لا اله الا الله کا کلمہ فطرت ہے۔ دونوں میں ربط ہے یا تضاد؟ آپ کلمے کی تفسیر بھی جانتے ہیں کیا ہے؟ کلمہ گو جانتا ہے کہ اس کلمہ میں کتنی معنوی گہرائی ہے؟ یہ کلمہ گو کہ ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو سمجھتے ہوں گے کہ نعوذ باللہ مصطفیٰؐ نے ایک نعرہ دیدیا تھا، اس عربستان میں جہاں ہر شخص ایک پتھر کو پوج رہا تھا، خداؤں کی کثرت تھی۔ وہاں لا اله الا الله کا نعرہ دیدیا۔ یعنی کسی کے لیے تو یہ صرف ایک دینی نعرہ ہے، ایک مذہبی نعرہ ہے، ایک سیاسی نعرہ ہے نعوذ باللہ!

اربابِ غرب، مغربی مفکّرین تو یہی کہتے ہی ہیں کہ حکومت اور سلطنت قائم کرنی تھی۔مصطفیٰؐ ایک ذہین بشر تھے، ذہین انسان تھے اور کیونکہ خاندانِ بنی ہاشم میں ان کی نظر میں ایک نفسیات قائم تھی حکمرانی کی تو انہوں نے حکمرانی کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لئے ایک نیا نظریہ پیش کیا۔

یہ قیاس ہے اپنے اوپر۔ جیسے حکمرانی قائم کرنے کے لئے کیسے نئے نئے نظریات گھڑے جاتے ہیں۔ نئے نئے آرڈر پاس کئے جاتے ہیں تا کہ حکمرانی کا سلسلہ باقی رہے اور جو آج کے مصطفیٰؐ کے دشمن مستشرقین کہتے ہیں یہی کسی باغیِ شام نے کہا تھا۔ میرا یہ فقرہ اربابِ ادب یاد رکھیں۔ میں امیر شام بھی نہیں کہتا، میں حاکمِ شام بھی نہیں کہتا۔ میں باغیِ شام کہا کرتا ہوں۔

باغیِ شام نے کہا تھا: لعبت بنوهاشم بالملك فلا ملك جآء ولا وحى نزلo بنو ہاشم نے تو حکومت قائم کرنے کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا نہ کوئی مَلَک آیا نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔

تو دنیا والے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ slogan ہے، نعرہ ہے لا الہ الا اللہo
علیؑ کہتے ہیں فطرت ہے لا الہ الا اللہo کیسے؟
اب بہت تفصیلی بیان ہے سمیٹ رہا ہوں۔ ادھورا رہ گیا کل سلسلہ جاری ہوگا۔
کائنات کا دو نقطۂ نظر سے مطالعہ کیجئے:
ایک philosophical point of view سے،
دوسرے philosophical argument کے ذریعے سے،
فلسفیانہ بُرہان کے ذریعے سے ایک عرفان و وجدان کے ذریعے سے۔

دو چیزیں ہیں ایک ہے فلسفیانہ بُرہان، اس کے قدم لفظوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ فلسفیانہ برہان لفظوں کے سہارے سے آگے بڑھتا ہے اور عارفانہ وجدان، جب روح کے قدم آگے بڑھتے ہیں تو حاصل ہوتا ہے۔

دونوں نقطہ نظر سے اس کائنات پر نظر ڈالئے۔ ہاں اسی پہاڑ پر، نیچر پر نظر ڈالئے۔ آپ کسے کہتے ہیں نیچر، یہی پھیلی ہوئی کائنات۔ اب پھر اس پر نظر ڈالئے۔ نام تو لینا پڑے گا سمجھنے اور سمجھانے کے لئے۔ پہاڑ کو دیکھئے یہ ہمیشہ سے تھا، ہمیشہ رہے گا۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی تو نہیں آئی۔

کہا: ''نہیں صاحب ایسا نہیں ہے۔ جہاں آپ ہمالہ دیکھ رہے ہیں یہ کبھی سمندر تھا۔'' ''اچھا! سمندر تھا گہرا۔ اب ہوگیا پہاڑ اتنا بلند!'' ''جی ہاں! یہ ہمیشہ سے نہیں تھا۔''
''آپ ہی کے علم نے اسے دریافت کرلیا؟''
''جی ہاں دریافت کرلیا۔''
''اچھا یہ ہمیشہ رہے گا اب تو۔''
''نہیں روئی کے گالے کی طرح ختم ہوجائے گا۔''
میں ابھی قران مجید کی آیت کا ترجمہ نہیں کررہا ہوں۔
سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب یہ پوری کائنات ختم ہوجائے

گی۔ یہ تجلی بار اور ضوفشاں، یہ سورج کی family یہ black hole بن جائے گا۔

''اچھا یہ ہمیشہ سے نہیں تھا اور ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اچھا یہ آپ کے امریکہ اور ایشیاء کے درمیان پھیلا ہوا سمندر ہے۔ یہ تو رہے گا ہمیشہ؟''

''نہیں یہ بھی نہیں رہے گا۔ آپ بالکل مکتب کے الف بے والے طالب علم معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بھی غبی قسم کے۔ یہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ختم ہو جائے گا۔ سمندر بھاپ بن کر نابود ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔''

''کیوں نہیں رہ جائے گا؟''

''کیونکہ ہمیشہ سے نہیں تھا اس لئے ہمیشہ رہے گا بھی نہیں۔''

نیچر کی بات ہو رہی ہے تو اس حقیقت کو اگر جملے میں لکھیں تو کیسے لکھیں گے؟ ....لکھیں گے یوں کہ یہ سب ممکن الوجود ہیں۔ یہ سب possible existents ہیں، یہ ممکنات ہیں۔ اچھا ممکنات کو ممکن بنانے والا کون ہوتا ہے؟

کہا: وہ واجب الوجود ہے۔ تو ساری بحث کا خلاصہ اس ایک جملہ میں آیا کہ تمام ممکنات ایک واجب الوجود میں ختم ہوتے ہیں۔ اسی حقیقت کی بہترین لفظی تعبیر ہے۔

"لا الہ الا اللہ" o علیؑ نے کہا: یہی کلمہ فطرت ہے۔

ایک جملہ کہوں اسے بھی یاد رکھئے گا۔ معجزات کی قِسمیں ہیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں اس منبر سے۔ ایک معجزہ قولی ہوتا ہے ایک معجزہ فعلی ہوتا ہے۔ فعلی معجزہ وہ ہے جو کام کی شکل میں دکھایا جائے۔ قولی معجزہ وہ ہے جو زبان سے کہہ دیا جائے الفاظ کی شکل میں۔ اور یہ بھی کہا تھا تین چار برس پہلے کہ قولی معجزہ زیادہ اہم ہوتا ہے فعلی کم اہم ہوتا ہے۔ جب کہ ہم عام طور پر اس کے برعکس سمجھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ فعلی معجزہ زیادہ اہم ہے (نہیں بلکہ) قولی معجزہ زیادہ اہم ہے۔

اب سمجھئے کہ جنگ خیبر میں، جنگ خندق میں، جنگ بدر میں، جنگ احد میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کی شمشیر زنی ان کا فعلی معجزہ تھا جس نے اس وقت کے الحاد و کفر و شرک

کے قلعوں کو مسمار کیا، ''نہج البلاغہ'' علیؑ کا قولی معجزہ ہے جو قیامت تک ذہنوں کے بتوں کو توڑتا رہے گا۔

جب بھی کسی دانشور کا، طالب علم کا ذہن اس پھیلی ہوئی، بکھری ہوئی کائنات میں بکھرنے لگے گا اور جلوۂ کثرت میں توحید سے بیگانہ ہونے لگے تو علیؑ آگے بڑھ کے کہیں گے، نہیں ذہن میں بتوں کو نہ سجاؤ، فطرت کی زبان کو سمجھو۔

کلمة الاخلاص هی الفطرة o فطرت کی زبان پر کلمہ ہے لا اله الا اللهo

جو کلمہ پورے صفحہ کائنات پر لکھا ہوا ہے چونکہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے سرزمین کربلا پر حسینؑ نے خون کے شوخ رنگ سے لکھا لا اله الا الله۔

فطرت کو سمجھنا ہو تو کربلا آؤ۔ اسی لئے کہا کہ یہ تفسیرِ فطرت کا مدرسہ ہے۔ یہاں سمجھ میں آئے گی فطرت کی زبان کیا ہے۔ ذرے ذرے کی زبان پر کون سا کلمہ ہے۔ توحید کسے کہتے ہیں۔ نبوت کسے کہتے ہیں۔ امامت و رہبری کیا ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے۔

ہاں یہاں باطن میں علم ہے جو ذات الٰہی سے عطا کردہ علم ہے۔ جسے کہتے ہیں علمِ لَدُنّی۔ ان ذواتِ مقدسہ کے ساتھ ہے کہ جو مدینۂ علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خزینہ دارِ مشیت الٰہی ہیں اور میں نے عرض کیا نا کبھی کبھی ان کا تصرّف ظاہر ہوتا ہے اشیاء پر۔ عموماً یہ انسانوں پر تصرّف کرتے ہیں۔ یہ تصرّف ہی تو ہے آقا کا کہ آپ کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔

خدا کی قسم بتایئے کہ کیا آپ اپنے ارادے سے رو رہے ہیں۔ آپ کے ارادے کو دخل ہے اس رونے میں؟......

حسینؑ کا نام سنا دل میں تڑپ اٹھی۔ کربلا کا کلمہ سماعت سے ٹکرایا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے.........یہ تصرّف ہے کسی کا۔

یہ دعائے زہراؑ کا تصرّف ہے۔ یہ آہ زینبؑ کا تصرّف ہے۔ یہ قربانیِ حسینؑ کا تصرّف ہے۔

یہ تصرّف قیامت تک رہے گا۔ مگر اس وقت میں ایک اور تصرّف کی طرف آپ کی توجہ دلاتا ہوں۔ باطن میں جب علم ہوتا ہے۔ تو کچھ اور ہوتا ہے اور جب باطن سے علم خارج میں آتا ہے تو کچھ اور کیفیت ہوتی ہے۔

۶۰ھ میں جب آقا چل رہے تھے مدینے سے تو اس وقت اگر کسی سے مدینے میں پوچھا جاتا کہ کربلا بھی کیا کوئی مقام ہے تو اکثر کہتے ہمیں نہیں معلوم۔ کچھ غالباً وہ جو برید کا کام کرتے تھے، جو قاصد کا کام کرتے تھے یا جو سیر وسیاحت کا ذوق رکھتے ہوں گے، وہ بتا سکتے ہوں گے کہ ہاں کوفہ کے قرب و جوار میں فرات کے ساحل پر نینوا اور کربلا ہے۔
لیکن ان کا علم کربلا جا کر ہوا ہوگا۔ اور پھر بھی جو کربلا کو بیان کر سکتے ہوں گے:

''کوفہ سے کچھ فاصلے پر ہے۔ فرات کے کنارے ہے۔ علقمہ اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔''

لفظوں سے کچھ بھی بیان کیجئے لیکن وہ بات تو پھر بھی پیدا نہیں ہوتی...... لیکن جس کے باطن میں علم تھا جب نانی سے رخصت ہونے لگے۔ اور جناب ام سلمہؓ نے کہا:

بیٹا سفرِ عراق کے لئے نہ جاؤ۔ میرے دل کو وحشت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ کہا: یا اماہ۔ اے مادر گرامی (ہاں جناب امِ سلمہؓ کو بھی ماں کہہ کر پکارتے تھے)۔ آپ کو دکھاؤں۔ آپ کو جس چیز سے وحشت ہے مجھے اس کا علم ہے۔

عراق کی سمت دستِ مبارک کو اٹھایا۔ زمینیں پست ہوئیں۔ زمینِ کربلا اٹھی۔ ہاتھ کو بڑھایا ایک مٹھی خاک کو لیا۔ ''نانی! اسے کسی شیشے میں رکھ لیں۔ اور مجھے اجازت دیں اور جب یہ خاک خون سے بدل جائے سمجھ لیجئے گا کہ حسینؑ قربان ہوگیا۔''

آپ کے آنسو کلمۂ توحید ہیں۔ حسینؑ پر رونا نعرۂ توحید ہے۔

حسینؑ سے توسل کرنا خدا پر توکل ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے اس خطیب منبر حسینی کے یاد رکھنا۔ حسینؑ سے توسل خدا پر توکل ہے۔

حسینؑ رخصت ہوگئے اور وہی خاک جو مٹھی میں اٹھا کر نانی کے سپرد کی تھی........

جب حسینؑ کا قافلہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک مرتبہ رکا اور ایک غبار اڑا۔ گرد اڑی تو حسینؑ نے تو فوراً پہچان لیا لیکن جو خاص خاص لوگ تھے، جو قافلہ تھا سب معصوم نہ تھے۔ سب حظیرہ دارِ مشیّت نہ تھے۔

محفوظ عن الخطا تھے مگر امام کے ہم رکاب تھے ان پر ایک خاص انداز سے بیان کرنے کے لئے پوچھتے ہیں: یہ کون سی سرزمین ہے؟

حر کہتا ہے: کربلا ہے۔

امام اُتر پڑتے ہیں کہ بس ہماری منزل آ گئی۔ یہیں پر خیمے لگادو۔ یہیں پر ہم قتل کئے جائیں گے۔ یہیں پر ہمارا کنبہ اسیر ہوگا۔

یہ فقرے امام نے کہے لیکن قبل اس کے کہ یہ فقرے ارشاد فرماتے سرزمین کربلا سے اٹھنے والی گرد ایک مرتبہ حسینؑ کی بہن کی محمل میں بھی آئی۔ اور زینبؑ کے مشام تک جب اس کی خوشبو پہنچی ہے تو زینبؑ نے کہا: میرے بھیا کو بلاؤ۔

حسینؑ قریب آئے: بھیا یہاں سے آگے بڑھ جاؤ۔ عجیب وحشت ہورہی ہے۔ اس مٹی سے لہو کی خوشبو آرہی ہے۔

غالباً اسی موقع پر حسینؑ نے کہا ہوگا: بہن زینبؑ اب آگے بڑھنے کا کوئی محل نہیں ہے۔ یہیں حجّت تمام ہونی ہے، یہیں ہمارے بچے ذبح ہوں گے۔ یہیں ہم قربان ہوں گے۔ یہیں تم کو میرا لاشہ اٹھانا ہوگا۔ یہیں زینبؑ، زہراؑ کی نمائندگی کرنا ہوگی۔ یہیں کہنا ہوگا: پروردگار ہم اہلبیت کی جانب سے ہماری یہ قربانی قبول فرمالے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ٥ رضاً بقضائہ وتسلیماً لامرہ

مجلس سوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! آپ حضرات کے اذہانِ عالیہ میں موضوع سخن محفوظ ہوگا، سلسلہ کلام بھی موجود ہوگا۔ بنیادی عنوان فطرت شناسی ہے۔ سالِ گزشتہ سے بھی یہ مجلسیں موضوع اور مضمون کے اعتبار سے کسی حد تک مسلسل اور متصل ہیں۔ کل تک جو گفتگو ہوئی اس میں، میں نے یہ گزارش کرنے کی کوشش کی کہ فطرت شناسی کا مرحلہ، علم شناسی اور حصولِ علم اور دارائیِ علم کے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے لئے عرض کیا کہ بہت تفاوت ہے، بہت فرق ہے خود مراتبِ علم میں۔ چاہے میں نے یہ فقرہ نہ کہا ہو لیکن یہ مضمون ادا ہو چکا۔ تصوراتِ علم میں علم کا جو تصور لوگوں کے پاس ہے وہ کچھ اور ہے۔ علم کا جو واقعی اور حقیقی تصور ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہم سائے کو نور سمجھتے ہیں نور کو کہاں سمجھ پائیں گے؟

عام طور پر جو تصور جو concept علم کا ہے وہ بہت ناقص ہے۔ ہمارا علم شکوک و

شبہات اور جہالتوں سے آلودہ ہے اور جو خالق کا علم ہے جہاں اشتباہ کا، شک کا، شبہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ علمِ خالق، پروردگار کی عطا ہی ہوا کرتا ہے۔علم کی وہ منزل انسانی اکتساب سے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی غیر معصوم اپنی ذاتی ریاضتوں سے معصوم نہیں بن سکتا۔ مومن بن سکتا ہے، متقی بن سکتا ہے مخلصین میں شمار ہوسکتا ہے مگر معصوم نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ معصوم کے لئے ''علمِ لَدُنّی'' شرط ہے، ''علمِ خالق'' شرط ہے۔ جہاں زندگی میں ایک بار بھی شک گزر گیا ہو وہاں عصمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

معصوم وہی ہوتا ہے کہ جہاں علمِ خالق ہو اور اپنی حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مجبوراً مجھے مثالیں دینی پڑتی ہیں سائینس سے، فلسفہ سے عام تاریخ سے، کہ یہ حقیقت، کمالِ علم کی حقیقت، جمالِ عصمت کی حقیقت، جلالِ وجود کی حقیقت یہ سب ہیں تو فطرت کے موضوعات۔ تو ممکن ہے کہ کوئی فطرت شناسی کے مرحلے سے گزر جائے اور کمالِ علم کو نہ پہچانے۔ فطرت کو کیا پہچانے گا۔ ممکن ہے کوئی جمالِ عصمت سے آشنا ہی نہ ہو اور یہ مدعی ہو جائے کہ وہ فطرت شناس ہے۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے ان مراحل سے گزرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے اس بات کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں کہ خارج سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ہی نہیں ہوتا وہ تو علم بنتا ہے جزوِ داخل بن جانے کے بعد۔

اس حقیقت کو آپ حاشاوکلّا یہ نہ سمجھیں کہ نکتے کو اور جملے کو مکرر عرض کر رہا ہوں۔ اور بعض باتیں تو مکرر عرض کرنے ہی میں لطف دیتی ہیں۔ آپ اذان سے چار بار اللہ اکبر نکال دیجئے۔ صرف ایک بار اللہ اکبر کافی ہے؟ نہیں کافی ہے۔ اور یہ لذت آشنائے ذکرِ خدا سمجھتے ہیں کہ ہر بار تکبیر میں ایک نئی معنویت سامنے آتی ہے، نیا مزا ملتا ہے، ایک نئی زندگی ملتی ہے، ایک نیا عروج حاصل ہوتا ہے۔ تکبیر کہنے کے ساتھ ساتھ پھر قدم زمین پر نہیں رہتے۔ جسم زمین پر رہتا ہے اور نفس کی بلندیوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ تکبیر کی صداؤں کے سہارے کتنا بلند ہوجاتا ہے نفسِ مومن۔

تو اس حقیقت کو سمجھیں کہ باہر سے جو بات عکس پذیر ہو رہی ہے۔ ہاں سوال کو ذرا سا لفظوں کو بدل کر پیش کروں تو شائد ایک نیا رخ سامنے آئے جو آج پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اب تک، گزشتہ سال کی تقریروں میں اور بہت سی تقریروں میں یہ بات کہیں بطور تمہید، کہیں بطور مقدمہ، کہیں بطور نتیجہ گزارش کی کہ خارج سے جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوتے ہیں وہ سب حواسِ خمسہ کے ذریعے سے یعنی لامسہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، سننے کی قوت، دیکھنے کی قوت، چکھنے کی قوت، سونگھنے کی قوت، چھو لینے کی قوت، یہ جو پانچ قوتیں ہیں یہ ہمارے لئے باہر کی چیزوں کو، باہر کے وجودات کو ہمارے جزوِ ذات بنانے میں مددگار ہوتے ہیں۔

گویا اب اسے تساہلِ تعبیر کہئے اور بہت دِقّت کے ساتھ کہیے گا تو شاید کہا جائے کہ یہ لفظیں درست انتخاب نہ کی جاسکیں۔ مگر تساہلِ تعبیر ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وسائلِ اخذِ علم حواسِ خمسہ ہیں۔ گویا خارج میں علم ہے اور ہم علم حاصل کر رہے ہیں اور وہ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کر رہے ہیں۔ اب اس میں کیا کمزوری ہے اور کیسی سچائی ہے وہ آپ کا ذہن خود تجزیہ کرلے گا گزشتہ دو تقریروں کی روشنی میں۔

لیکن اب ایک سوال اور ہے کہ یہ بھی آپ کے ذہن عالی میں بات آچکی کہ اصل علم تو نفس کے اندر ہوتا ہے۔ اصل علم تو جزوِ روحِ انسانی ہے۔ وہی چیز جسے شعورِ علم انسانی کہتے ہیں وہی تو عین عِلم ہے۔ شعور ہی عین عِلم ہے۔ یہ شعور یعنی خارج کا عِلم حاصل ہوتا ہے خواسِ خمسہ کے ذریعے سے۔ داخل کا عِلم منتقل کن ذرائع سے ہوتا ہے؟ کن وسائل سے ہوتا ہے؟

اس سوال کو کل اور پرسوں پیش ضرور کیا تھا لیکن ذرا سے فرق کے ساتھ آج پیش کر رہا ہوں۔ میں نے مثالیں دی تھیں۔ کتاب، کاغذ، قلم اور مصوری کے تمام وسائل اور ذرائع۔ لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی اور اس اعتبار سے پوری نہیں ہوئی کہ وہ عِلم کہ جو

انسان کے اندر موجود ہے اس کے لئے پانچ حواسِ باطنی کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ میں مقدمتاً کہہ کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ پانچ حواسِ ظاہری اور اس کے ساتھ پانچ حواسِ باطنی۔

ایک حسِ مشترک، دوسرے خیال، تیسرے قوت واہمہ، چوتھا حسن باطنی (قوتِ متخیلہ) اور پانچواں قوتِ ذاکرہ یا حافظہ........اصطلاحات کا فرق ہے فلاسفہ کے یہاں، حکماء نے الگ الگ terminolgies مقرر کیں مگر پانچ باطنی حواس ہیں پانچ ظاہری حواس کے مقابلے میں۔ کیا یہ حواس ذریعہ بنتے ہیں باطن کے علم کو خارج میں لانے میں؟.........نہیں......... یہ بھی کام نہیں آتے۔ یہ پانچ حواس تو یہی حواس خمسۂ ظاہری کے حاصل کردہ معلومات کی مزید processing کرکے جزوِ ذہن انسانی بناتے ہیں۔

(ابھی خارج سے داخل کی طرف سفر ہے)۔ ہاں مددگار ہوتے ہیں، دو جانبہ رول ادا کرتے ہیں مگر بنیادی کام ان کا یہ ہے کہ خارج کے معلومات کو جزو ذہنِ انسانی بنائیں، چاہے یہ حواس خمسۂ ظاہری ہوں اور چاہے حواس خمسۂ باطنی۔ کیسے؟..........

ابھی یہ حواس خمسۂ باطنی بھی اندر کے علم کو باہر منتقل کرنے میں مددگار نہیں ہیں۔ ان کے ذریعے سے علم باہر نہیں آتا۔ اگر انہی کو وسیلۂ ظہور وخروج وصدرو اظہارِ علم سمجھ لیا جائے تو بہت سی مشکلیں پیدا ہوجائیں گی۔ ظاہر ہے کہ عمومی طور پر یہ مسائل نہیں چھیڑے جاتے، مجھے اندازہ ہے۔

لیکن پھر عرض کروں گا کہ اس مجمع میں ایک عامی بھی آتا ہے ایک عارف بھی آتا ہے۔ ایک مزدور بھی آتا ہے اور ایک دانش جُو بھی آتا ہے اور اگر کوئی دانشجو یا دانش پسند یا دانش ور فلسفہ اور عرفان کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ کہیں اُسے اشتباہ ہوجائے اور اس طرح کا اشتباہ ہوجائے کہ یہ جو وحی کے نزول کا مسئلہ ہے، جبرئیلؑ کے نزول کا مسئلہ ہے۔ پیغمبرؐ پر جبرئیلؑ نازل ہوتے تھے کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ صرف رسولؐ دیکھتے تھے۔ جبرئیلؑ کی آواز کوئی نہیں سنتا تھا صرف رسولؐ سنتے تھے۔ تو کہیں ایسا تو نہیں

کہ یہ ان کے ترقی یافتہ قوتِ متخیلہ کی کارفرمائی تھی؟

دانشور حلقوں میں یہ سوالات ہیں اور اگر یہ سوالات کہیں رہ گئے تو بنیادِ دین متزلزل ہو جائے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں جیسے حقیقتِ نبیؐ، حقیقتِ نبوت پر یہ بحث ہوتی ہے کہ آخر جبرئیلؑ کی حقیقت کیا ہے؟ ملائکہ کی حقیقت کیا ہے، وحی کی آواز کیسے سنتا ہے نبی؟ دوسرے کیوں نہیں سنتے؟........ یعنی نبیؐ مجمع عام میں ہیں۔ ایک سے ایک چاہنے والے، قریب سے قریب بیٹھنے کے لئے کوشاں، انفاسِ قدسیہِ پیغمبر کو بھی محسوس کر رہے ہیں مگر جو چیز پیغمبرؐ محسوس کر رہے ہیں اسے وہ درک نہیں کر رہے ہیں۔

تو یہ کیا حقیقت ہے۔ کیا یہ قوت متخیلہ کی کارفرمائی ہے جیسے انسان سوچ لیتا ہے بہت سی باتیں اور کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھا ہوا جو سوچتا ہے وہ نظر بھی آنے لگتا ہے اسے۔ کیا نعوذ باللہ ایسا ہوا؟........ یعنی پھر نعوذ باللہ دین کی جڑیں متزلزل ہو جائیں گی۔ یعنی جبرائیلؑ پیکرِ تخیلِ مصطفٰےؐ کا نام ہوگا نہ کہ فرشتہ خدا کا نام۔

احساس ہے کہ کس مرحلہ سے گفتگو گزر رہی ہے۔ اس مرحلہ سے گفتگو گزر رہی ہے کہ خارج میں جو ہمارے حواس خمسہ ہیں انہیں بھی سمجھیں کہ یہ ابھی باطن کے علم کو خارج میں لانے کے وسائل نہیں ہیں۔ ان کے عمل کو سمجھیں، ان کے حدود کار کو سمجھیں۔ اور اس کی ایک مثال دوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو، ذرا سی ان کی ذہانت کو spoil کر دیا جاتا ہے۔

اب میں بار بار معذرت کرتا ہوں کہ کسی زمانے میں انگریزی کے کلمات منبر سے ادا کرنا سوءِ ادب سمجھا جاتا تھا اور اب میں spoil جیسا کلمہ استعمال کر رہا ہوں تو جن حضرات کے ذوق پر گراں گزرے وہ مجھے معاف فرمائیں گے لیکن شاید یہ آج کی عام ضرورت کا تقاضا ہے۔ آپ کی ذہانتوں کو (پھر دوسرا کلمہ وہی آیا) polluted کر دیتے ہیں۔ مسموم بنا دیتے ہیں، زہر گھول دیتے ہیں۔ زہر افشانی ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر ہمارے آج کے نوجوان طالب علم کے ذہن میں عظمتِ وحی نہیں ہے

حقیقتِ توحید نہیں ہے اور جہاں توحید ہی کمزور ہوگی جہاں وحی پر یقین نہ ہوگا وہاں ناموسِ نبوت کا کہاں احترام رہ جائے گا اور جہاں نبوت کا شعور نہ ہوگا وہاں امامت کی بصیرت کیا حاصل ہوگی۔ اور جہاں امامت کی معرفت نہ ہوگی وہاں آخرت کہاں سلامت رہ جائے گی؟

اس لئے یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان مسائل سے گزروں اور آپ کو بھی ساتھ میں گزاروں۔ آخر آپ نے اپنا ایک گھنٹہ امانتاً مجھے دیا ہے۔ اب میرا تو یہ کام نہیں ہے کہ میں اس ایک گھنٹے کو spoilt کروں اور spoil کروں اور polluted کروں۔ مجھے بھی تو جواب دینا ہے کہیں۔ خدا کی قسم! میں اس منبر سے بھی وہی کہنا چاہتا ہوں جو عقیدہ لے کر وہاں جاؤں گا۔

اچھا تو اب کیا کہا جاتا ہے کہ اصل علم تو سائنس ہے۔ میں سائنس کا ہرگز مخالف نہیں ہوں۔ بار بار کہتا ہوں۔ پچھلے درسوں میں بھی کہا سائنس کا مخالف نہیں ہوں سائنس خوب پڑھئے۔ مگر سائنس کو بھی spoil نہ کیجئے۔ ہر چیز کی حد ہے۔ اس کی حد کو پہچانئے۔

ایک بہت بڑے سائنٹسٹ تھے جو کنکورڈ یا یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ میرے بعض احباب نے مذاکرہ رکھا، مباحثہ رکھا اور میں نے کہا کہ آپ کی فزکس کسی ماورائی طاقت تک پہنچاتی ہے؟ خدا کا شعور پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟

انہوں نے جواب میں کہا کہ فزکس کا موضوع خدا نہیں ہے۔ فزکس کا موضوع تو ہے فزیکل ورلڈ۔ یہ گریز تھا۔ یہ صحیح جواب نہیں تھا۔ ضرور فزکس کا موضوع فزیکل ورلڈ ہے۔ ضرور فزکس کا موضوع خدا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور خدا کسی علم کا موضوع بھی نہیں بن سکتا!

موضوع تو بنتی ہیں محدود چیزیں..... وہ موضوع نہیں بن سکتا لیکن اتنا ہے کہ کوئی بھی موضوع اٹھاؤ، کسی بھی مضمون میں ڈوب جاؤ وہ آپ سے نکلتا بھی نہیں۔

حواس خمسۂ ظاہری پر زور دینے والے، تجربی علوم پر زور دینے والے بھئی جو کچھ ہے بس جب تک تجربے سے نہ گزر جائے، محسوس نہ ہوجائے، دیکھ نہ لیں ہم، چھو نہ لیں، ذائقہ نہ محسوس کرلیں، سونگھ نہ لیں اس وقت تک ہم کسی چیز کے ہونے کا اعتراف نہیں کریں گے۔

اچھا اب میں سادہ سا سوال کررہا ہوں۔ ایک عرصے سے سن رہا ہوں کہ چار طاقتیں، چار بڑی یونیورسل forces دریافت کی گئی ہیں۔

Weak nuclear forcex, Stronge gravitational force,

Nuclear force,

اور اسی طرح چار forces ہیں۔

اور اب اس پہ کام یہ ہورہا ہے کہ ان سب کو ایک میں بدل دیا جائے۔ کہ وہ ایک ہی ہے۔ اور اس پہ آپ حضرات واقف ہیں مجھ سے زیادہ۔ میں پوچھتا ہوں یہ gravitational force جسے کہتے ہیں اس کی خوشبو کیا ہے؟

کہیں گے: ''آپ بالکل مکتب گئے ہی نہیں ہیں۔''

''nuclear force کی کیسی smell ہے؟''

کہا: ''نائٹروجن گیس میں تو smell ہوتی ہے لیکن nuclear force میں کوئی smell نہیں ہوتی۔''

''تو اس کی شکل کیا ہے، صورت کیا ہے؟ نرم ہے سخت ہے۔ آخر فورس کہہ رہے ہیں آپ، قوت کہہ رہے ہیں تو اس میں تو سختی ہوگی!''

کہا: ''نہیں۔''

''کہیں نظر آئی آج تک؟''

کہا: ''نہیں۔''

''اگر نظر بھی نہیں آئی اور خوشبو بھی نہیں سونگھی اور چھو کر بھی نہیں دیکھ سکے اور قائل

ہیں کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ gravitational force نام کی کوئی چیز نہیں ہے، کوئی انکار نہیں کرتا۔ اچھا ایک gravitational force کا انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ حواس خمسہ ہمارے جو ظاہری ہیں ان کی گرفت میں تو وہ نہیں ہے۔ نہ سامعہ کی گرفت میں ہے نہ باصرہ کی گرفت میں ہے۔ یہ gravitational force جو سورج کی تمام family کو ایک مرکز پہ باندھے ہوئے ہے زمین کو ہلنے نہیں دیتی، چاند کو ہٹنے نہیں دیتی، سورج سے دور نہیں جانے دیتی زمین کو۔ یہ سیارات اور ستاروں کی دنیا یہ مستحکم ہے اس کی گھن گرج کیسی ہوگی؟''

کہا: ''نہیں گھن گرج بھی نہیں ہے اس میں۔ ہوائی جہاز جو گزرتا ہے تو اس میں تو آواز ہے لیکن gravitational force میں کوئی آواز نہیں۔''

معلوم ہوا کہ سامعہ کی گرفت سے بھی باہر۔ نہ سامعہ کی گرفت میں، نہ باصرہ کی گرفت میں، نہ ذائقہ کی گرفت میں، نہ شامہ کی گرفت میں، نہ لامسہ کی گرفت میں۔ تو پھر نہیں ہوگی۔''

''نہیں ہے!''

''تو کیا حواس خمسہ یہ سب بے کار ہو گئے؟''

کہا: ''نہیں بے کار نہیں ہو گئے حواس خمسہ نے دیکھا کہ درخت سے سیب گرا زمین کی طرف اوپر کیوں نہیں گیا۔''

''ارے دیکھا آنکھوں نے سیب کو گرتے ہوئے زمین پر اور آپ ایک خاص قسم کی کشش کے قائل ہو گئے۔ دیکھا کچھ قائل کسی اور بات کے ہوئے۔ دیکھا کہ درخت سے ٹوٹ کر سیب گرا زمین پر تو سوچنے لگے یہ سب زمین ہی پر کیوں گرا آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ کوئی ستارہ چلا تو ہم نے سوچا علیؑ کے دروازے پر کیوں آیا کہیں اور کیوں نہیں گیا؟''

جملے میں جو فاصلے ہیں وہ آپ پُر کیجئے گا۔ یہ آپ کا ہوم ورک ہے۔ فاصلے میں

چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر کبھی کبھی الفاظ کو دہراتا ہوں تو بڑی بڑی عبارتیں چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ ان عبارتوں کو پُر کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نے صرف دیکھا کہ سیب گرا تو آپ ایک کشش کے قائل ہو گئے۔ ہم نے مصطفٰےؐ کو دیکھا اور ہم خدا کے قائل ہو گئے۔

خدا کی قسم! جمال و جلالِ مصطفٰےؐ کی کوئی انتہا ہے؟ مصطفٰےؐ نے خود فرمایا:

من رانی فقد را الحقo جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھ لیا۔

اب یہ اپنی اپنی نظر ہے کوئی space پر جا کر ٹھہر جاتی ہے اور کوئی شجر طیبہ کے آثار تک جاتی ہے۔ یہاں بھی لفظ شجرہ ہے۔

الم ترکیف ضرب اللّٰہ مثلاً کلمۃ طیبۃً کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماءo (سورۂ ابراہیم آیت ۲۴)

ارے کیا تم دیکھتے نہیں ہو، کیا سوچتے نہیں ہو کہ یہ پروردگار نے کس طریقے سے کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے دی ہے۔ (کل کلمہ کی بات تھی آج شجرہ کی بات ہے)۔

آیت قرانی ہے، روایت نہیں ہے۔ ''الم ترکیف ضرب اللّٰہ مثلاً'' ارے تم دیکھو تو سہی ''ترکیف'' میں کیا لطف ہے! کیسے اللہ نے مثال دی۔ یعنی کسی اور میں یہ قدرت تھوڑی تھی کہ کلمہ توحید کو شجر توحید سے سمجھاتا۔ کسی اور میں یہ صلاحیت نہ تھی، یہ قوت نہ تھی، یہ قدرت نہ تھی کہ کلمۂ توحید کو، لا الہ الا اللّٰہ کی حقیقت کو سمجھا سکتا۔

کلمۂ طیبہ کیا ہے لا الہ الا اللّٰہ۔ خدا مثال دے رہا ہے۔ شجرۂ طیبہ سے۔ ارے بھئی! روایت نہیں ہے، میر انیسؔ یا نسیمؔ امروہوی کا مرثیہ نہیں ہے۔ قران ہے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ ہم نے کیسے کلمۂ طیبہ کو شجرۂ طیبہ سے مثال دی۔

کلمۂ طیبہ پہ سب کا اتفاق ہے، کلمہ طیبہ لا الہ الا اللّٰہ ہے۔ شجرہ طیبہ سے اختلاف کر کے دیکھو۔ مصطفٰےؐ کے علاوہ کوئی اور شجرہ طیبہ لا کر دکھاؤ۔

الم ترکیف ضرب اللّٰہ مثلاً۔ میں کبھی کبھی قران کے کلمات کو جو دہراتا ہوں اس لئے کہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ جتنی بار کہو اتنی ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ''کیف''۔

کہنے والا کون ہے۔ ارے ہم جو کیفیتوں میں مبتلا رہتے ہیں، وہ کہہ رہا ہے جو کیفیات سے بلند ہے۔ وہ فرما رہا ہے جو کیفیات وکمیات سے بلند تر ہے۔

"الم تر کیف" o تم دیکھتے نہیں ہو غور نہیں کرتے ہو۔ کیسے؟

بات یہ ہو رہی تھی کہ حواس خمسہ بیکار ہو جاتے ہیں...... نہیں بے کار نہیں ہیں وہ سیڑھیاں ہیں، زینے ہیں جب تک پہلے زینے پر قدم نہ رکھیئے گا دوسرے زینے پر قدم نہیں رکھ سکتے، اور دوسرے پر قدم نہ رکھیئے گا تو تیسرے پر قدم نہیں رکھ سکتے، تیسرے پہ قدم نہ رکھیئے گا تو چوتھے پر نہیں ...... زینے ہیں۔ اسی طرح باہر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انہی زینوں سے گزرتا ہے، انہی مرحلوں سے گزرتا ہے۔ تو حواس خمسہ میں سے باصرہ نے دیکھا کہ سیب ٹپکا، تو اب حواس خمسہ کا کام ختم ہوا۔ حسِ مشترک میں ایک بات آ گئی۔

حسِ مشترک باقی حواسوں میں سے پہلا مرحلہ۔ جو چیزیں حس مشترک میں آتی ہیں یہ پہلے عمومی تصویر کشی ہوتی ہے اور اسی کے بعد وہ ایک محافظ خانے میں جمع کی جاتی ہیں اس کا نام ہے خیال ...... ظرفِ خیال۔ کہتے نہیں ہیں...... ایک واقعہ ہوا تھا آپ کو خیال نہیں ہے؟ یعنی آپ کو یاد نہیں ہے۔

یہ خیال، یہ یاد ان چیزوں کے متعلق ہے کہ جو "ابعاد ثلاثہ" رکھنے والی چیزیں ہیں۔ یعنی لمبائی، چوڑائی، گہرائی، وزن، یہ سب چیزیں جو ہیں یہ ظرفِ خیال میں حسِ مشترک سے آتی ہیں۔ اس کے بعد قوتِ واہمہ کام کرتی ہے۔ یہ باطنی قوت ہے ظاہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ قوت وہ کام کرتی ہے کہ جہاں پر حواسِ خمسہ کی گرفت میں آنے والی چیزیں نہ ہوں مگر کچھ ہوں۔

سیب نظر آنے والی چیز ہے، درخت نظر آنے والی چیز ہے، زمین نظر آنے والی چیز ہے۔ یہ جو چیزیں نظر آنے والی تھیں وہ نظر آ گئیں اب یہ وجہ کہ یہ نیچے کیوں آیا یہ نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ اوپر کیوں نہ گیا۔ یہ نظر آنے والی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اوپر ایک بسیط فضا نظر آ رہی ہے۔ اب ایک شے ہے جو کہیں کچھ ہے جو نظر نہیں آ رہی ہے تو جو

چیز حواس خمسہ کی گرفت میں نہ ہو، وہاں قوت واہمہ آ کر کارفرما ہوتی ہے اور وہ جن چیزوں کو حاصل کرتی ہے وہ جزوِ قوتِ متخیلہ بنتے ہیں۔ یہ چوتھا مرتبہ ہے جس سے تیزی سے گزر رہا ہوں ورنہ ہر ایک کے ساتھ مثالیں ہیں۔

جزوِ قوتِ متخیلہ بننے کے بعد پھر وہ حافظہ و ذاکرہ وہ پانچوں حواس........ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ابھی یہ حواس خمسہ باطنی بھی خارج ہی کی معلومات کو جزوِ ذات بنانے میں مددگار ہیں۔ ابھی تک معلومات باہر سے منتقل ہو کر ظرف نفس میں آ رہی ہیں۔ لیکن جو ظرف نفس میں ہے وہ چیز باہر کیسے جائے گی؟ سوال یہ ہے کہ عِلم کا اندازہ کیسے ہوگا کہ سچا علم کس کے پاس ہے؟ مکمل عِلم کس کے پاس ہے؟ یا عِلم نام کی کوئی بھی شے کسی کے پاس ہے یا نہیں ہے؟ عِلم ہے تو کس رتبے کا ہے؟ یہ نہ حواس خمسۂ ظاہری بتائیں گے، نہ حواس خمسۂ باطنی۔

بحث بالکل علمی ہے اور ہمیں یہ توقع ہے کہ آپ حضرات بہرحال ان ابحاث کو یاد رکھیں گے ان شاء اللہ۔ اور یہ کئی علوم سے وابستہ ہیں۔ ظاہر کی دنیا باطن میں جب منتقل ہو رہی ہے تو یہ دس حواس کام میں آ گئے۔ ظاہری اور باطنی ملا کر۔ باطن میں جو علم ہے وہ آیا کہاں سے؟ اور وہ جو ہے وہ خارج میں آئے گا کس طرح سے۔ کل تک تصرف کی بات تھی آج ایک کلمہ کو بدل رہا ہوں۔

اصل میں ایک لفظ اگر آپ کہیں کہ داخل میں علم جو ہے وہ ظاہر ہوتا ہے انسان کے فعل سے۔ یا دوسرا کلمہ۔ علم ظاہر ہوتا ہے ارادے سے۔ لفظ ارادہ بھی ہماری اردو زبان میں بہت کثیر معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اصل عربی میں ارادے کے معنی بہت دقیق ہیں اور علم کلام میں ارادے کے معنی اور بھی دقیق تر ہیں۔ اور جو لوگ عِلم کلامِ استدلالی کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ علم اور ارادے کا ربط ہے۔ خدا مرید ہے۔

دینیات میں پڑھا ہے یا نہیں؟ .... خدا کیا ہے؟ مرید ہے۔ پروردگار کے صفات سلبیہ میں ہے نا! نہیں ثبوتیہ میں ہے۔ خدا کے صفات ثبوتیہ میں ہے خدا مرید ہے، خدا

صادق ہے، خدا متکلم ہے۔ لیکن اس سے پہلے کیا ہے خدا عالم ہے، خدا حیّ ہے، خدا قادر ہے۔ یہ باتیں منبرِ حسینی سے نہ کہی جائیں گی تو کہاں سے کہی جائیں گی۔ حسینؑ جس نے لا الہ الا اللہ کا کلمہ سمجھایا۔ اسی کے حوالے سے اُسی پلیٹ فارم سے صفات خدا کی بات سمجھ میں آئے گی۔ اسی حوالے سے فطرت شناسی کے درس مکمل ہونگے۔

پروردگار عالم کے علم اور اس کے ارادے میں ربط ہے۔ پروردگار مرید اس لئے ہے کہ وہ عالم ہے۔ وہ عالم ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ مرید ہے۔ مرید یعنی صاحب ارادہ۔

پھر ایک جملہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ جناب والا! ہماری خانقاہوں میں تو مرید اسے کہتے ہیں جو بے ارادہ ہوگیا ہو۔ بہ بین تفاوت رہ از کجا تا بہ کجا۔ روز یہ مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے۔ مرید کہتے ہیں اس کو جس کے پاس ارادہ ہو اور ہم مرید اسے کہتے ہیں جو بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ کر ہی نہ پائے ایک حرفِ مہمل کی طرح رہ جائے لیکن یہ عوامی مفہوم ہوگا۔ حقیقتاً عرفان کے دائرے میں، حقیقتاً جو واقعی معنویت اور عرفان رکھنے والی بارگاہیں اور خانقاہیں ہیں وہاں ایسا نہیں ہے۔

''مُرید'' صاحبِ ارادہ کو کہتے ہیں۔ ''صاحبِ ارادہ'' یعنی وہ جس کے اندر کسی چیز کی چاہت ہو، ''مُرید'' یعنی جسے طلب ہو۔ ایک مُرید کو مُرید اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ''پیر'' یا اپنے مُرشد یا اپنے عالم یا ولی خدا یا عارف باللہ کا چاہنے والا ہوتا ہے اور اس کے ذریعے سے خدا کی مرضی کا چاہنے والا ہوتا ہے۔ اسے طلب ہوتی ہے مرضات الٰہیہ کی۔ اللہ کی مرضی کی چاہت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ مُرید ہوتا ہے۔ ارادہ یعنی طلب۔

یہ بحث اصول فقہ میں بھی آتی ہے، یہ بحث علم کلام میں بھی آتی ہے، یہ بحث علم نفس میں بھی آتی ہے۔ تین علوم میں بطور خاص یہ ہے۔ ارادہ کی ماہیت، ارادہ کی حقیقت، ارادہ ہے کیا؟ ارادہ یعنی طلب، ارادہ یعنی چاہت۔ مُرید یعنی چاہنے والا۔ اور میں نے کہا یہی ارادہ اندر کے علم کو بتاتا ہے کیسے؟

ارادہ کس شے کا کیا؟ جتنا جس کا علم ہوگا ویسا ہی ارادہ ہوگا۔ یعنی ہمیں بس دنیا کی اہمیت کا علم ہے۔ ہم دنیا کی قدر جانتے ہیں۔ تو طلب بھی ہمیں بس دنیا کی ہوگی۔ ہمارے لئے سب کچھ زر ہے۔ زر یا زن یا زمین جو بھی ہو یا اقتدارِ دنیا۔

جس چیز کا ہم ارادہ رکھ رہے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ظرف قلب میں اسی کا علم و یقین ہے۔ یعنی اگر نظر تخت پر ہے، نظر تاج پر ہے، نظر حکومتِ دنیا پر ہے اس کا مطلب ہے کہ دنیا کا علم ہے عقبیٰ کا علم ہی نہیں ہے۔

اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں علم تو سب ہے مگر پھر علم کے ساتھ یقین کا فرق ہوتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ کراچی میں عزاداری ہوتی ہے اور میری بات سمجھی جاتی ہے اور مجھے علم ہے کہ کسی اور شہر میں بھی میری بات سمجھی جاتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ کراچی میں زیادہ بات سمجھی جائے گی۔ تو میری کوشش ہوگی کہ کراچی کا دعوت نامہ قبول کرلوں (مثال دے رہا ہوں اس سے زیادہ نہ سوچئے گا کچھ)۔

اب اگر مجھے علم ہے لیکن یقین میں فرق ہے تو بھی ارادے سے کوئی چیز ظاہر ہوگی۔ ارادے سے کیا چیز ظاہر ہوتی ہے؟ ارادوں سے وہ علم ظاہر ہوتا ہے جو بے شائبہ ِشک ہو۔ جس علم میں شک کا دخل نہ ہو۔ دنیا کے ہونے کا علم ہے۔ اس لئے کہ ہے نظر آرہی ہے۔ دنیا کے ہونے کا یقین ہے شک نہیں ہے۔ آخرت کے ہونے کا علم تو ہے ہاں ٹھیک ہے قران میں تذکرہ ہے۔ ہاں پیغمبرؐ نے بتایا ہے، ہاں سبھی سمجھتے ہیں مگر آخرت دیکھی کس نے ہے۔ استغفراللہ!

اس کے معنی ہے کہ علم تو ہے مگر یقین نہیں ہے جس چیز کی طلب ہوتی ہے اسی پر یقین اور علم ظاہر ہوگا۔ اب نہ پوچھو علیؑ نے دنیا کا تخت کیوں نہ مانگا علیؑ کو آخرت پر یقین تھا۔ دنیا والے دنیا طلب کرتے رہے۔ علیؑ آخرت کو طلب کرتے رہے۔

سنا تو سب نے تھا جو کچھ مصطفیٰؐ نے کہا لیکن وہ جزو یقین جو بنا وہ ہر ایک کے ارادے سے ظاہر ہوگا۔ وصیت تو پیغمبرؐ نے سب سے کی، بار بار کی، میں دنیا سے جا رہا

ہوں دو چیزیں چھوڑ کر قران اور اپنی عترت اہلبیت ۔ حاشا نہیں چھوڑنا نہیں یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک حوض کوثر پہ ملاقات نہ ہو۔ اب جسے کوثر پر یقین ہوگا ، وہ ان دو میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ قران چھوڑے گا نہ، دامن اہلبیت ۔ مگر جیسے ہی مصطفیٰؐ کی آنکھ بند ہوگی اب وہاں ارادوں سے پتہ چلے گا یقین کیا ہے ۔ مرید کا ارادہ ہی تو بتائے گا اگر مرید مصطفیٰؐ کے سرہانے بیٹھا رہے تو خدا طلب ہے اگر مرید کہیں اور جا کر تخت و تاج کی طلب میں لگ جائے تو معلوم ہوا دنیا پر یقین ہے آخرت پر یقین نہیں ہے۔

خدا آپ کے ایمان کو استحکام عطا فرمائے۔ خدا بحق مصطفیٰؐ آپ کو حضورؐ کی وصیّت پر عمل پیرا رکھے۔ حضورؐ نے کچھ وصیتیں عمومی فرمائی تھیں، بار بار فرمائیں۔ کچھ وصیتیں خصوصی فرمائیں۔

جو سرہانے بیٹھا تھا اس سے کہا: علیؑ میں اعلان تو کر چکا تمہارے حق کا بار بار لیکن دیکھو جب دنیا والے دنیا کی طلب میں لگ جائیں تو تم خدا کی طلب سے غافل نہ ہونا۔

رسول کی وصیّت پر عمل علیؑ نے کیا اور بتایا کہ میرا علم کیا ہے، میرا یقین کیا ہے، میرے ارادے سے پہچانو میرا علم کیا ہے۔

علیؑ کا ارادہ بتاتا ہے کہ خدا کی معرفت کیسی ہونی چاہیے۔ اہلبیت کا ارادہ بتاتا ہے کہ معرفت کیسی ہونی چاہیے اس چیز کو بھولئے گا نہیں۔ یہ خطابت نہیں ہے یہ خلاصہ علمِ کلام ہے۔ یہ استدلالی بحثیں ہیں جو technical terminology میں حوزۂ ہائے علمیہ میں ہوتی ہیں۔ میں نے انہیں تعمیمی شکل میں پیش کر دیا۔ یہ کوئی سیاسی گفتگو نہیں ہے۔ یہ کوئی سخن گسترانہ بات نہیں ہے۔ علم و ارادے میں وجودی رشتہ ہے اسے سمجھیں۔

خارج کا عکس قلبِ انسانی اور ظرفِ ذہن انسانی میں منتقل ہوتا ہے، حواس خمسہ کے ذریعے سے کہ جو ظاہری ہیں، حواس خمسہ کے ذریعے سے کہ جو باطنی ہیں لیکن جو داخل کا علم ہے وہ نہ قلم سے ظاہر ہوگا نہ کتاب سے ظاہر ہوگا نہ تقریر سے ظاہر ہوگا وہ ارادہ سے

ظاہر ہوگا۔ طلب کس کی ہے؟

اسی لئے پہچانیں۔ جتنے انبیاء ہیں انہیں طلب کس کی ہوتی ہے؟......

خدا کی طلب ہوتی ہے۔

معرفت کا درس حاصل کرنے والو!

علم و عرفان کی بادۂ جاں فزا نوش فرمانے والو! جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا......اس میں کوئی شک نہیں ہے بڑا جاں فزا ہے یہ بادہ۔ بادۂ عرفان۔ یہیں تو پتہ چلتا ہے نشۂ عرفان کی کیفیت میں کہ طلب کس کی ہے۔

خدا کی طلب کے معنی کیا ہوتے ہیں؟........ جو کسی کو نظر نہیں آتا اس کی طلب یا جس کے جسم نہیں ہے اس کی طلب؟ جو مکان نہیں رکھتا اس کی طلب؟........ جو زمان میں محصور نہیں ہے اس کی طلب؟

ہاں اس کی طلب اسی کو ہوگی جس کا ظرف نفس اتنا ہی وسیع ہوگا۔ جسے اس کا علم ہوگا، جسے اس کا ادراک ہوگا، جسے اس کا یقین ہوگا جس نے اس کی موجودگی کا تجربہ کیا ہوگا۔

خدا کی طلب! خدا کی طلب! خدا کی طلب!........

یہ نعرہ سننے والے سمجھیں تو خدا کی طلب ہوتی کیا ہے؟ کوئی کر سکتا ہے خدا کی طلب؟ دست ادب!........ ہم کاذب ہیں، جھوٹے ہیں، ہم خدا کی طلب کر ہی نہیں سکتے خدا کی معرفت کر نہیں سکتے تو طلب کیا ہوگی؟ ہم خدا کی طلب کر ہی نہیں سکتے۔ معرفتِ علم کر نہیں سکتے تو ہم طلب کیا کریں گے۔

خدا ہمارے ظرفِ ذہن کا معلوم بن ہی نہیں سکتا۔ جب علم ہی نہیں ہوگا تو طلب کا کیا سوال۔ ہم تو طلب اس کی کر سکتے ہیں جسے دیکھ سکیں جس کی خوشبو کو سونگھ سکیں، جس کے لطف سخن سے محظوظ ہوسکیں۔ یعنی ہماری زندگی کی آخری طلب اگر کوئی ہوسکتی ہے تو یا مصطفےٰؐ کی طلب ہوگی یا مرتضیٰؑ کی طلب ہوگی یا زہراؑ کی طلب ہوگی یا حسنؑ و حسینؑ کی طلب ہوگی۔

اولیاء اللہ کی طلب ہماری زندگی کا ہدف ہے۔ اللہ کی طلب اُن کی زندگی کا ہدف ہے۔

سب مسلمان سن لیں، سارے انسان سن لیں، میں فقط مسلمانوں کے لئے گفتگو نہیں کرتا، سارے انسانوں کے لئے گفتگو کرتا ہوں اگر خدا کی طلب ہے تو نقشِ قدمِ مصطفیٰؐ کی جستجو میں رہو۔ خدا کے مرید ہو تو غلامِ مصطفیٰؐ بن جاؤ۔ دیکھو مصطفیٰؐ کے قدم جس جس ڈیوڑھی پر نظر آئیں بس وہاں سے پیشانی اٹھنے نہ پائے۔

دیکھو مصطفیٰؐ اپنے حجرے سے اُٹھے ہیں، بلالؓ صبح کی اذان دینے والے ہیں مگر محراب پہ جانے سے پہلے مصطفیٰؐ درِ سیدہؑ پر چلے گئے السلام علیکم یا اھل البیت۔

کہاں گئے مصطفیٰؐ؟........ درِ سیدہؑ پر۔

دونوں بازو دروازے کے اپنے ہاتھوں میں لئے۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا٥ الصلوٰۃ یا اھل البیت۔

تاریخ میں یہ منظر موجود ہے۔ صحیح صحیح حدیث کی کتابوں میں یہ سب موجود ہے۔

مصطفیٰؐ کے نقش قدم دیکھو کہاں کہاں ہیں۔

خدا کی طلب ہے تو مصطفیٰؐ کے نقش قدم دیکھو،

خدا کی طلب ہے تو مرتضیٰؑ کے نقش قدم دیکھو۔

یہ اس کے مرید ہیں تم ان کے مرید بن جاؤ۔

خدا کی طلب ہے تو حسنؑ اور حسینؑ کے نقش قدم کو دیکھو۔

انسان کے عمل سے، انسان کے ارادے سے اس کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ حسینؑ کے عِلم کا اندازہ کرو گے؟........ حسینؑ خدا کا عِلم و یقین رکھتے ہیں، خدا کی طرف ان کے قدم اٹھ رہے ہیں اگر خدا طلبی ہے تو حسینؑ کے کاروان میں شامل ہو جاؤ۔

دیکھو اگر حسینؑ دنیا طلبی کے لئے نکلتے تو یوں حُر کے رسالے کو پانی نہ پلاتے۔ حسینؑ سرچشمہ آبِ بقا ہیں۔ یہ دریاؤں کا پانی کیا حقیقت رکھتا ہے؟ چھاگلوں میں بھرا ہوا پانی۔ جیسے ہی حُر کا ایک ہزار کا رسالہ آیا پہلا حکم یہ دیا اپنے سپاہیوں اور جاں نثاروں کو: یہ

پیاسے ہیں انہیں پانی پلاؤ۔

میں نے کوئی مصیبت نہیں پڑھی ابھی۔ آپ چیخ رہے ہیں، رو رہے ہیں، گریہ کی آواز بلند ہے۔ کون کہتا ہے ہم مصیبتوں پر روتے ہیں۔ ہم اپنے آقا کی فضیلتوں پر مسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ ہم انسان کی محرومیوں کا ماتم کرتے ہیں۔

یہ حسینؑ کا فیاضانہ سلوک یہ حسینؑ کا عارفانہ سلوک، یہ حسینؑ کا رہنمایانہ سلوک، یہ حسینؑ کا رہبرانہ اقدام، یہ حسینؑ کا مربیانہ سلوک، یہ حسینؑ کی تجلّیِ ربانی: یہ پیاسے ہیں انہیں پانی پلاؤ۔

کل عرض کر چکا دو محرم کو قافلہ کربلا پہنچ گیا تھا۔ مگر اب تسلسل کلام میں بات یہاں تک آ گئی ہے تو عرض کر رہا ہوں۔ ایک ہزار کا رسالہ جب امام کے سامنے آیا ہے تو اس سے کچھ نہیں پوچھا آنے کا مقصد کیا ہے۔ پوچھا ہی نہیں آنے کا مقصد کیا ہے۔ دیکھا آ رہے ہیں یعنی اتنا حواس نہ تھا کہ سلام کرتے۔ پیاس کا غلبہ تھا۔ توہین نہیں محسوس کی، اہانت نہیں، انانیت نہیں........ نظر ڈالی: ارے یہ پیاسے ہیں۔ عباسؑ پانی پلاؤ۔

اکبرؑ انہیں پانی پلاؤ۔ صرف سپاہیوں کو نہیں۔

عزیزو! گھوڑوں کو اتنا دوڑایا گیا تھا تپتی ہوئی دھوپ میں کہ گھوڑوں کی زبانیں پیاس کی شدت سے مُنہ سے باہر نکل آئی تھیں۔ تاریخ میں ہے۔ طشت میں، لگن میں، ظرف میں پانی بار بار بھر کر ایک ایک گھوڑے کے سامنے لاتے تھے۔ جب تک وہ گھوڑا پانی سے سیراب ہو کر منہ خود نہیں ہٹا لیتا تھا پانی نہیں ہٹایا جاتا تھا۔ ایک ایک گھوڑے کو سیراب کیا گیا۔

اور ایک شخص ہے جس کا نام ہے علی بن طعان محاربی۔ تاریخ میں نام موجود ہے۔ ابن طعان محاربی کہتا ہے میں اتنا پیاس سے مغلوب تھا، میرے ہوش و حواس سلامت نہ تھے۔ مجھے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ آنکھوں میں دھندسی تھی۔ امام کی آواز سن رہا تھا۔

امام نے اس کے اونٹ کو دیکھا کہ پیاسا ہے۔ امام نے کہا کہ اپنے راویہ کو بٹھا

دو۔ راویہ حجاز کے محاورے میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس پر پانی بار کیا جائے اور عراق کے محاورے میں راویہ کہتے ہیں مشک کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا آقا کیا کہہ رہے ہیں تو امام نے لفظوں کو بدل دیا یعنی امام سمجھ رہے ہیں کہ یہ محاورہ نہیں سمجھا۔ امام نے کہا اپنے اونٹ کو بٹھادو۔ بٹھایا گیا اس کے بعد کہا: انہیں پانی پلاؤ.........اسے مشک کا دہانہ نظر آرہا ہے۔

امام نے آواز دی: پانی پیو۔ پانی پلایا جارہا ہے.........اب وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا یہ پیکرِ جمال وجلال اپنی جگہ سے اٹھا۔ آقا حسینؑ آئے اپنے چلو سے پانی پلایا۔ اس کو پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی پلایا۔

آقا آج آپ پانی پلارہے ہیں۔ عباسؑ پانی پلارہے ہیں۔ کل آپ کا چھ ماہا زبان سوکھی ہوئی دکھائے گا پانی نہیں ملے گا۔ تیرِ سہ شعبہ کا نشانہ بنے گا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون وسیعلون الذین ظلموا ای منقلبٍ ینقلبون

مجلس چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! قران حکیم کے سورۂ مبارکہ روم کی تیسویں آیت کے کلمات کی برکت سے اور اس ارشاد الٰہی کی روشنی میں فطرت شناسی کے اسباق آگے بڑھ رہے ہیں۔

رب کریم ارشاد فرماتا ہے: فاقم وجهك للدينِ حنيفاo

تم بغیر کسی انحراف کے اپنا رخ دین کی طرف کرلو۔

فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیھاo

یہ وہ فطرت الٰہیہ ہے کہ جس پر اللہ نے لوگوں کی طبیعتوں کو ڈھالا ہے۔

لا تبدیل لخلق اللّٰہo اللہ کی بنائی ہوئی کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ذلك الدین القیّمo یہی زندگی ساز دِین ہے۔

ولکن اکثر الناس لا یعلمونo لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

یہ کلمات بے انتہا تفکر چاہتے ہیں۔ قرآن مجید شریعت سہلہ لیکر ضرور نازل ہوا ہے لیکن سہل انگاری کا سبق نہیں دیتا۔ قرآن مجید نے جو شریعت عطا فرمائی ہے وہ سہل ہے، آسان ہے، مشکل نہیں ہے لیکن وہ انسان کے لئے سہل انگاری اور تساہل کو روا نہیں رکھتی۔

کوئی علمی مسئلہ ہو، کوئی فکری مسئلہ ہو، کوئی اعتقادی مسئلہ ہو، کوئی دینی مسئلہ ہو یا زندگی کا کوئی عملی مسئلہ ہو، اسے یونہی انجام نہ دیجئے۔ تساہل پسندی کو کہیں دخل نہیں ہے اور جب تساہل پسندی کو کہیں دخل نہیں ہے یعنی جب اس نے انسان کو آسانیاں فراہم کر دیں تو وہ نہیں چاہتا کہ انسان زندگی کو کھلواڑ کی شکل میں گزارے اور اس لئے جو کام بھی کرے وہ متانت سے کرے، وہ سنجیدگی سے کرے۔ اور اس لئے اگر ہم آپ بھی گفتگو کریں تو سنجیدگی سے کریں۔

تفکر درکار ہے، تعمق درکار ہے۔ گہرائیوں میں اترنے کی ضرورت ہے، بلندیوں کو چھونے کی ضرورت ہے۔ سطحی زندگی نہ بسر کیجئے۔ نہ فکری نہ علمی نہ عملی۔

کل تک کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ علم و ارادہ میں ایک ربط خاص ہے۔ یہ اسرار فطرت میں سے سب سے لطیف اور سب سے دقیق سِر ہے۔ یہ ایک راز ہے۔ کہ عِلم اور ارادہ میں ایک رشتہ ہے، ایک ربط ہے اور جیسے جیسے عِلم مکمل ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ارادہ پختہ تر ہوتا جاتا ہے۔ ارادے انہی کے کمزور ہوتے ہیں جن کی علمی بنیادیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ ان کے ارادے کمزور نہیں ہوا کرتے جن کا عِلم کامل تر ہوتا ہے۔ علم و ارادے میں ایک رشتہ ہے اور خود ارادہ بھی کبھی نظر نہیں آتا۔ ارادے کے آثار ہی تو نظر آتے ہیں۔ دیکھئے تو سہی کیا کیا دیکھنے کی کوشش کیجئے گا جو نظر نہ آ سکے۔

آپ کا ارادہ ...... آپ بیٹھے ہوتے ہیں اپنے ڈرائینگ روم میں اور کوئی شخص پوچھ رہا ہے: کیا ہے آپ کا ارادہ ؟ اگر ارادہ نظر آنے والی چیز ہوتی تو پوچھتا کیوں؟ ...... ہے ارادہ آپ کے پاس یا نہیں؟...... اب کچھ تو ارادہ ہوگا ؟ کھانے کا پینے کا ارادہ ہوگا، پلانے کا ارادہ ہوگا، پذیرائی کا ارادہ ہوگا، کہیں جانے کا ارادہ ہوگا۔

اچھا کھانے پینے ہی کی باتیں کرنی ہیں۔ اس دنیا میں ہمارے بڑے بڑے مدّبرین زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت کو یہی کہتے ہیں کہ کھانا پینا ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان یہ تین مشکلیں ہیں اور ان میں سب سے بڑی مشکل تو روٹی ہی کی ہے۔ تو آپ اگر بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کا ارادہ کچھ کھانے کا ہے تو کچھ بھی کھالیں گے کیا؟

آپ کو پہلے علم ہوگا بہت سی خوردنی اشیاء کا .... کھانے کی جو چیزیں ہیں اور آپ کے کھانے کے لائق جو چیزیں ہیں، جو ایک انسان کے کھانے کے لائق چیزیں ہیں، جو ایک شریف اور پاکیزہ نفس انسان کے کھانے کے لائق چیزیں ہیں، ان کا عِلم ہوگا اور ہر ہر چیز کی خصوصیت کا عِلم ہوگا۔ کہ اس کا فائدہ کیا ہے، نقصان کیا ہے، اس کی لذت کیسی ہے۔ اس کی خوشبو کیسی ہے، یہ چیز کھا کر کہیں میری شوگر بڑھ تو نہیں جائے گی؟

یہ سب آپ کو عِلم ہوگا تو کسی شے کے متعلق آپ کا ارادہ ہوگا مجھے یہ کھانا ہے یہ نہیں کھانا ہے۔

یہ بات تو سب کی سمجھ میں آرہی ہوگی نا!......... ارادہ متعلق ہوگا۔ طلب متعلق ہوگی۔ آپ اپنے ملازم سے کہیں گے: میرے لئے فلاں چیز لے آیئے۔

یہ فلاں چیز کیوں لے آیئے؟ اس کی طلب کیوں ہوئی؟....... اس لئے کہ اسی کا عِلم ہوا آپ کو۔ اور اپنے علم کی روشنی میں آپ نے اس کا انتخاب کیا۔ ارادے کے دو سِرے سامنے آئے ایک وہ جو آپ کے علم سے متعلق ہے، ایک وہ جو آپ کے فعل سے متعلق ہے۔ جب آپ نے لقمہ اٹھا کر دہن مبارک میں رکھا تو ارادہ کا پتہ دوسروں کو چلا ورنہ ارادہ تو تھا آپ کے پاس، ارادہ کا دوسرا سرا علم سے متعلق تھا، جب تک آپ محاسبہ کرتے رہے، کیا چیز کل کھائی تھی، کیا آج کھائی جائے۔ کیا چیز کل مفید ہوئی تھی، کیا مضر ہوئی تھی آج کیا چیز کھاؤں جو طبیعت کے لئے مُصلِح ہوگی۔ یہ سب محاسبہ ہورہا تھا۔ پھر ذہن کو یکسوئی حاصل ہوئی۔ طبیعت میں یکسوئی پیدا ہوئی یعنی مختلف چیزوں میں محاسبہ کے بعد جب ربط و تعلق قائم ہوا، ایک نتیجہ پر پہنچے تو طبیعت کو یکسوئی نصیب ہوئی اور ارادہ بنا

مگر ابھی کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس لئے کہ ارادہ کا ایک سرا ہے جو عِلم سے متعلق ہے۔ نہ عِلم نظر آتا ہے اور نہ وہ چیز نظر آتی ہے جو بلا فصل عِلم سے جڑی ہوئی ہو۔

ارادہ کا ایک سرا نظر نہیں آرہا ہے جب یہ فعل میں بدلے گا، جب فعل اس کے نتیجے میں صدور میں آئے گا، جب ظہور وحدوث میں آئے گا تب ارادہ سب کو نظر آئے گا۔

اچھا ارادہ جب آپ کے پاس تھا مگر ارادہ کا عملی اظہار نہیں ہوا تھا تو آپ کے ہاتھوں میں لقمہ آپ کی آنکھوں نے بھی نہ دیکھا تھا، دوسرے کیا دیکھتے!

ذرا ان علمیاتی مسائل سے گزریے۔ یہ سب علمیاتی مسائل ہیں، علم سے متعلق Issues ہیں، یہ etymological issues ہیں جو discuss کر رہا ہوں آپ کے سامنے کہ جناب والا علم ہے، ارادہ ہے لیکن آپ کی یہ آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں۔ آپ کی آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں مگر ارادہ کا پورا علم ہے۔

آپ کے ہاتھوں میں لقمہ نہیں ہے، آپ کے دہن تک لقمہ نہیں گیا، سامنے نعمتیں چنی ہوئی ہیں، آپ کی زوجہ محترمہ بیٹھی ہوئی ہیں، بچے بیٹھے ہوئے ہیں، اعزاء، اقرباء، احباب بیٹھے ہوئے ہیں، آپ تشریف فرما ہیں۔ اور آپ ارادہ کر چکے ہیں کہ کیا کھانا ہے، آپ کو اپنے ارادہ میں کوئی شک نہیں، آپ کی آنکھوں میں بھی عکس نہیں ہے مگر ارادہ کا علم موجود یعنی آپ کے ارادے کی، آپ کی طلب کی ایک وہ منزل ہے، ایک وہ وجودی مرتبہ ہے، ایک وہ سطح ہے ہونے کی۔ ارادہ کے ہونے کی ایک وہ سطح ہے کہ جو متحقق ہو جائے نفس کے اندر تو اعضائے ظاہری کو پتہ نہیں ہوتا۔ مگر دل میں پوری تصویر ہوتی ہے۔

انتہائی دقیق مرحلے سے لے کر گزرنا چاہ رہا ہوں۔

عزیزان محترم! آپ کا ارادہ آپ کی یہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں۔ مگر ارادہ بالکل واضح ہے، دل میں، ذہن میں، بالکل کوئی شک نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ ارادہ کیا ہے۔ دوسروں کو پتہ چلے گا جب کہ عِلم صادر ہوگا۔ یعنی ایک شے آپ کے پاس ایسی

ہے جو آنکھیں تو نہیں دیکھتیں مگر دل دیکھتا ہے۔ اب خدا کا ایک مرید جب عبادت کرتا اور پوچھنے والا پوچھتا ہے: کیا آپ نے رب کو دیکھا؟

کہا: میں ایسے رب کی عبادت ہی نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو، مگر فوراً کہا: یہ آنکھیں نہیں دیکھتیں، دل کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔

کس کا جملہ ہے یہ؟......... میں بتاؤں گا؟....... ارے ایک سے زیادہ کہنے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا!

اس یکتا ویگانہ خدا کا یکتا ویگانہ بندہ ہے علیؑ۔ اس کے علاوہ کسی کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی نہیں۔ اس لئے حوالہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بعض حوالے ایسے ہیں کہ کہو یا نہ کہو۔ ذہن وہیں جاتا ہے۔ اور خاص طور سے الٰہیات کی بحثیں وہ ہیں کہ خدا کے متعلق جب بھی بحث ہوگی ذہن علیؑ تک جائے گا۔ میں کیا کروں!

دیکھئے بات کہاں پہنچ گئی۔ میں تو بس اتنی سی بات کہہ رہا تھا کہ علم اور ارادہ میں ایک رشتہ ہے۔ اور ارادہ بھی نظر نہیں آتا۔ ارادہ کے دو سرے ہیں، ایک کا تعلق علم سے ہے جب تک مجرّد علم سے تعلق ہوگا، جب تک ایک abstract relation ہوگا knowledge سے اس وقت تک ارادہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ لیکن جب یہ فعل میں تبدیل ہوگا تب نظر آئے گا۔

اچھا یہ بندوں کے ارادے کی کیفیت ہے......... اُس کے ارادوں کی کیفیت کیا ہوگی اور جب وہ اعلان کرے:

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا ٥

اللہ ارادہ رکھتا ہے، کیا ارادہ رکھتا ہے کہ اے اہلبیتؑ تم کو ایسا پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

اب دیکھئے ''رکھے'' تو میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ ''پاک کرے'' کیوں ترجمہ نہیں کر رہا ہوں؟......... ''دور رکھے'' .... دور کی جاتی ہے وہ چیز جہاں ہو اور دور رکھی جاتی ہے

وہاں سے جہاں پہلے سے نہ ہو۔

اچھا آپ کہیں گے اعتقادی باتیں کرنے لگے۔ میں بالکل اپنے اعتقادات سے دست بردار ہوجاتا ہوں۔ اور سادہ سی بات پوچھتا ہوں۔ وہ خدا جو مسلسل اپنے لئے تنزیہ وتقدیس کے کلمات ارشاد فرماتا ہے:

پاک وپاکیزہ ہے وہ خدا، پاک وپاکیزہ ہے وہ خدا۔

سبحان الذی اسرٰی بعبدہ ٥ پاک وپاکیزہ ہے وہ خدا۔

سبح اسم ربك الاعلیٰ ٥ اپنے اعلیٰ رب کی پاکی بیان کرو۔

فسبح ربك العظیم ٥ اپنے عظیم پروردگار کی پاکی بیان کرو۔ عام ترجمے میں ہیں نا!..........

وہ پاک وپاکیزہ پروردگار اس نے تو کسی چیز کو نجس نہیں پیدا کیا۔ لیکن وہ یہ جانتا ہے، علم (رکھتا ہے)، جیسے آپ کے سامنے جو کچھ چن دیا جاتا ہے دسترخوان پر، ہر شے کے بارے میں آپ جانتے ہیں۔ یہ کیا ہے، یہ کس کمپنی کا بنا ہوا بسکٹ ہے، یہ مٹھائی کس دوکان سے بنی ہوئی ہے۔ یہ گھر میں بنی ہے، یا باہر سے آئی ہے۔ اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ یہ بالکل صاف ستھری بنی ہوئی ہے یا اس میں کہیں سے گردوغبار کی آمیزش ہوسکتی ہے۔ جیسے آپ کے سامنے سب آئینہ ہے ایسے اس خالق کے سامنے پوری کائنات آئینہ ہے۔

ہم نے تو بنایا سب کو طیّب و طاہر۔ کوئی طہارت کو محفوظ رکھ سکتا ہے، کوئی آلودہ ہوسکتا ہے۔ کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ سب کے اعمال، سب کے ارادہ، سب کی سطح علمی سے واقف ہے۔ سب کی استعداد سے واقف، سب کی صلاحیتوں سے واقف۔ اس لئے جب اس کا ارادہ کسی سے متعلق ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمام عالم خلقت پر نظر ڈال کر پہچان لیا کہ کمال ان ہی میں پایا جاتا ہے۔ اور جب کمال انہی میں پایا جاتا ہے تو ان سے برائیوں کو دور رکھو۔ انہی سے رجس ونجس ونَجَس وکفروشرک، ہر چیز کو دور رکھو۔

اب ایک جملہ جو کہیں پہلے کہہ چکا ہوں آج پھر دوران تقریر میں آ گیا تو عرض کروں کہ کچھ عملی باتیں بھی ہوتی رہیں، کچھ عمومی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کسی ایک فرقے کا نہیں سوائے کچھ لوگوں کے جن کا اسلام خود مشکوک ہے وہ امتِ مسلّمہ کے کچھ مسلّمہ عقیدوں کو سلب کرنا چاہتے ہیں۔ تمام امتِ مسلّمہ کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ پنجتن پاک اہل بیت مصطفےٰؐ میں سے پنجتن پاک یہ افراد ہیں:

پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام،

بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا،

سبط اکبر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور سید الشہداء سبطِ اصغر، امام حسین علیہ السلام۔

یہ سب کا مشترکہ عقیدہ ہے کسی ایک فرقہ کا نہیں ہے اور یہ عقیدہ امت نے اجماع کر کے نہیں بنایا۔ یہ عقیدہ امت نے اجماع کر کے، شوریٰ کر کے، selection کر کے یا مفکروں سے پوچھ کر نہیں بنایا، دانشوروں سے پوچھ کر یہ عقیدہ نہیں بنایا، کسی اقتصادی مصلحت کے تحت یہ عقیدہ نہیں بنایا کہ ان کو مانیں گے تو کچھ ملے گا۔ ان سے ملنے کی امید ہی تو تھی کہ ان سے ملتا رہے گا دنیا والوں کو تو ان کے دروازے پر جمع ہوتے رہیں گے۔ اسی لئے ان کی جائیدادیں غصب کر لی گئیں مگر یہ غصب کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ صرف مادی خیرات ان کے در سے نہیں ملتی، وہ روحانی اور معنوی خیرات ملتی ہے کہ دنیا پھر بھی ان ہی کے دروازے پر آتی رہے گی۔ تو کوئی اقتصادی مصلحت نہ تھی پنجتن پاک کو پنجتن پاک ماننے کی، کوئی سیاسی مصلحت بھی نہ تھی پنجتن پاک کو پنجتن پاک ماننے کی۔ بلکہ الٰہی اعلان تھا، ارادۂ الٰہی کا اظہار تھا۔

قران مجید میں دو آیتیں موجود ہیں جن کی بنیاد پر پنجتن کی شخصیتیں پہچانی گئیں۔ آیت مباہلہ اور آیت تطہیر۔ فقل تعالوا ندع ابنآء نا وابنآء کم ونسآئنا ونسآئکم وانفسناو انفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنت اللہ علی الکاذبین٥ (سورۂ آل عمران ۶۰) یہ آیت پنجتن پاک کا تصور دے رہی ہے۔ آیتِ تطہیر پنجتن پاک کا تصور دے رہی

ہے........

تو جنابؐ والا یہ قرانی عقیدہ ہے۔ یہ عرفانی عقیدہ ہے اور تمام امت اسلامیہ کا عقیدہ ہے۔ درمیان میں بات آ گئی تھی۔ اس میں کوئی بھی شخص حضرت علیؑ کو مستثنیٰ نہیں کر سکتا۔ ممکن نہیں ہے کہ ذات علیؑ کو نظر انداز کیا جا سکے۔ میرا عموماً اسلوب گفتگو یہ نہیں ہوتا کہ کسی اور کی تقریر کا کبھی تقریر کی شکل میں جواب دوں۔ وہ بھی ایسوں کی تقریر کا؟........ کہ جن کو اگر میں جواب دیدوں تو ان کی اہمیت بن جاتی ہے۔ لیکن جب بات اہلبیت کے تعلق سے ہوتی ہے تو پھر ایک عمومی اشکال کی صورت میں اس کا جواب دیا جاتا ہے، پھر خاموشی کفر ہے، اولیاء اللہ کا دفاع نہ کرنا خدا سے بغاوت ہے۔

تو ایک بزرگ نے (بزرگ کے لفظ پر آپ پریشان نہ ہویئے گا، بزرگ تو ہر طرح کے ہوتے ہیں) ایک بزرگ نے کچھ نام لئے اور کہا اصل پنجتن پاک تو یہ ہیں۔ اور اس میں معلوم ہے کون کون نام نہیں تھے؟ فاطمہؑ کا نام نہیں تھا۔ کوئی مسلمان سنے گا؟ اور کس کا نام نہیں تھا؟........ رسولؐ کے آغوش نور کے تربیت یافتہ حسنؑ اور حسینؑ یہ دو نام نہیں تھے........ دیکھئے تو!........ پیغمبرؐ جن کے بارے میں کہیں کہ میں ان سے ہوں ان کا نام حذف کر دیا گیا۔ لیکن علی علیہ السلام کا نام وہاں بھی موجود ہے........ تو اتنا متشدد انسان بھی حضرت علیؑ کا نام نکال نہ سکا۔

اب میں عرض کروں کہ جب یہ پنجتن پاک ہیں، یعنی حضرت علیؑ بہرحال شامل ہیں۔ کوئی بھی فہرست بناؤ گے تو علیؑ کا نام نکل نہیں سکتا پنجتن پاک ہیں طیب و طاہر ہیں اللہ نے کیا کہا؟ ہم ان سے رجس کو دور رکھیں گے ایسا کہ جو دور رکھنے کا حق ہے۔

یہ بات زبان پر آ گئی آج موضوع میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ ایک لفظ ''یُرید'' سے بات یہاں تک آ گئی آپ حضرات کے ذہنوں میں ہوگا کہ ''رجس'' صرف مادی کثافتوں کو نہیں کہتے۔ بلکہ معنوی رجس بھی رجس ہے مثلاً شک رجس ہے۔

امام راغب اصفہانی جس نے قران پاک کی ڈکشنری لکھی اور کہا: کفر رجس ہے۔

خدا نے کیا کہا ؟.......... کہ یہ وہ افراد ہیں جن سے میں رجس کو دور رکھنا چاہتا ہوں۔ ایسا کہ جو دور رکھنے کا حق ہے۔ علیؑ جب تک اس میں شامل ہیں علیؑ کے نزدیک نہ کفر آ سکتا ہے نہ شرک .... میں کہتا ہوں۔ کہ اس آیت سے جو استدلال کیا جائے گا اس میں علیؑ کی شمولیت صرف علیؑ کے ایمان پر گواہی نہیں دے گی۔ بلکہ یہ بھی بتائے گی کہ علیؑ جس آغوش میں تربیت پا رہے تھے وہاں بھی نہ کفر کا دخل تھا نہ شرک کا امکان۔

کل کسی عزیز نے کہا تھا کہ کچھ تذکرہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بھی کریں۔ ہمارے تذکرہ کرنے کے وہ محتاج نہیں ہیں وہ تو وہ ہیں کہ جب تک ان کا ذکر آئے گا نہیں بات آگے بڑھے گی بھی نہیں۔ اور دانشور سامعین کے سامنے عرض کر رہا ہوں چاہے علم کی بات ہو یا ارادہ کی، خطیب نہج البلاغہ نے نصیحت کی ہے، وصیّت کی ہے، سفارش کی ہے، اپیل کی ہے، نصاب ادب بنا کر دیا ہے۔

علموا اولاد کم شعر ابی طالب٥

اپنے بچوں کو ابوطالبؑ کے شعر تعلیم کرو، پڑھاؤ۔

لان فیه علم کثیر ٥ اس لئے کہ اس میں بہت علم ہے۔

علم کی بات کرو گے تو وہ ادب کے حوالے سے ابو طالبؑ تک پہنچے گی۔ اور ارادہ کی بات کرو گے تو حضرت ابوطالبؑ کی شان !اللہ اکبر! ارے دنیا والے تلوار سے وہ کام نہ لے سکے جو ابوطالبؑ کی پُر ارادہ نظروں نے کام انجام دیا ہے۔

تلوار، نیزہ، لشکر کچھ نہیں .... ایک طرف پورا کفر و شرک و نفاق کا لشکر ایک طرف تنہا ابوطالبؑ کی نظر........ نظروں سے کیا ارادہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر کسی نے گستاخی کی تو آج قلع قمع ہو جائے گا۔ یعنی تلوار اٹھائی نہیں ارادہ ظاہر تھا۔ یہ ہے قوتِ ارادیِ ابو طالبؑ۔

جس کی نگاہوں سے نصرت ایمانی کا اندازہ ساری دنیا کو ہو جائے اس کے ظرف علم میں ایمان کی کیا کیفیت ہوگی۔

شروع ہی سے عرض کر رہا تھا نا، ارادوں کے دو سرے، ایک فعل سے ظاہر ہوتا ہے ایک نظر نہیں آتا سمجھ میں نہیں آتا، جب نظروں سے سمجھ میں آجائے......... ارے بھئی کوئی اعلان کرے گا، کوئی تقریر کرے گا، کوئی تلوار اٹھائے گا، کوئی صف بندی کرے گا تو پتہ چلے گا کہ کس کی نصرت کرنا چاہتے ہیں، کس کی مدد کرنا چاہتے ہیں، ان کا ایمان کیا ہے، عقیدہ کیا ہے۔ جب تک بتائیں گے نہیں اس وقت تک پتہ نہیں چلے گا اور یہاں تو بڑے سے بڑے کافر کی ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ ابو طالبؑ سے جا کر کچھ کہے، اس لئے کہ جیسے ان کے پورے پیکر سے ارادہ ظاہر ہے۔ جس کے پیکر سے ارادۂ نصرت دین ظاہر ہو اس کے قلب کے ایمان کی کیا کیفیت ہوگی؟

یہ دونوں چیزیں ہیں اسی ربط و تسلسل کے ساتھ، ایمان کا تعلق، یقین کا تعلق علم سے ہے اور ایمان کے اظہار کا تعلق ارادہ سے ہے اور علم اور ارادہ میں ایک ربط ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کہیں ارادہ پایا جائے اور علم نہ پایا جائے اور علم پایا جائے اور ارادہ نہ پایا جائے۔ وہیں ارادہ نہ ہوگا جہاں علم نہ ہوگا۔ خدا عالم ہے تو مرید بھی ہے۔ اور یہ صرف اس کا ارادہ ہے کہ جس شے کو جیسے چاہے بنائے اور جہاں چاہے رکھے۔

آپ جس قسم کی forces تلاش کریں، جس قسم کی کششیں تلاش کریں، آپ جس طرح بھی نیچر کو پرکھیں اور سمجھیں۔ آپ جس طرح بھی فطرت پر نظر ڈالیں آپ اتنا تو بتایئے کہ یہ زمین ایک عامی انسان کو تو یکساں نظر آتی ہے، اور اسی زمین سے، ایک ہی زمین ہے، اس میں پانی بھی ایک ہی طرح کا جا رہا ہے اور اسی زمین سے کیا الگ الگ، طرح طرح کے گل بوٹے پھوٹتے ہیں۔

نیچر کو observe کیجئے۔ دیکھئے نا! یہ ہو کیا رہا ہے؟ ایک ہی طرح کی کائنات ہے، پانی وہی آ رہا ہے ایک۔ ہوائیں بھی ہیں، سورج کی شعاعیں وہی ہیں، زمین وہی ہے، محنت مزدوری، پسینہ سب وہی مگر اس کا نتیجہ الگ الگ۔ یعنی نیچر کی طبیعت یہ نظر آتی ہے کہ ایک طبیعت کی یکساں چیزیں نیچر خلق ہی نہیں کرتی۔ کوئی دو انسان ایک طرح کے

نہیں۔ کوئی دو پتیاں ایک طرح کی نہیں ۔ کوئی دو پھول ایک طرح کے نہیں ۔ اب سمجھو وہ کیسا غنی ہے، کیسا مصور ہے۔

ازدواج اور ثنویّت ہے فطرت شناسی کے مرحلے میں ۔ یہ دیکھئے کہ ایک مصور نقاشی کرتا ہے ، نقاشی کے لئے اس کے پاس ایک صفحہ ہوتا ہے۔ ایک صفحہ ہے، کچھ رنگ ہیں، موقلم ہیں، کام ہو رہا ہے۔ نقش رنگا رنگ بن رہے ہیں۔ ایک عام مصور کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک طرح کی دو تصویریں نہیں بنانا چاہتا اور اگر اس میں originality ہے تو اس سے بن ہی نہیں سکتیں۔

جب بھی کوئی تصویر بنائے گا دوسری تصویر اس سے مختلف ہوگی۔

جب بھی کوئی کتاب لکھے گا دوسری کتاب اس سے مختلف ہوگی۔

شاعر جب بھی اپنے شعر پر نظر ڈالے گا اسے اس میں ترقی کا امکان نظر آئے گا۔

خطیب جب بھی کسی مضمون کو ادا کرے گا چاہے مضمون وہی رہے ، نکتہ وہی رہے ، موضوع وہی رہے مگر مضمون کے برگ و بار بدل جائیں گے۔ یعنی فطرت میں تکرار نہیں ہے، تجلی میں تکرار نہیں ہے۔ تو کس چیز پر نقش و نگار بن رہے ہیں وہ بہر حال عام انسانوں میں یکساں ہے۔ کاغذ، یکساں، مواد یکساں۔ صرف اسی پر صورت گری ہو رہی ہے اس میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ لوگوں نے اسی پر قیاس کر کے سمجھا کہ پروردگار نے بھی اس کائنات کو ایسے ہی بنایا ہے۔ اس لئے فلسفہ میں بڑا مشکل مرحلہ آیا کہ لوگ ''ہیولہ'' کے قائل رہے۔

ہیولہ اور صورت۔ ایک بڑا دقیق مسئلہ ہے۔ کیا ہے ہیولہ ؟ اس کی مثال لے لیجئے جیسے آپ طرح طرح کے شربت بنا لیجئے ، ہر شربت کا رنگ الگ ہے اور اس کی لذت اور خوشبو الگ ہے لیکن شربت ہے تو اس میں پانی کا عنصر بہر حال ہوگا۔ لیکن وہ جو بنیادی عنصر ہے پانی وہ نظر نہیں آئے گا آپ پانی کہیں گے بھی نہیں اسے۔ آپ کی ضیافت میں دس رنگ کے شربت لے کر آ گئے کہا کہ نہیں مجھے سادہ پانی دے دیجئے۔ کہا : پانی ہی تو ہے۔ کہا: نہیں مجھے پانی چاہئے۔ یہ نہیں پیتا میں۔

پانی سب میں ہے مگر اب اسے پانی نہیں کہہ رہے ہیں۔ اس کے اوپر جو رنگ آمیزی ہوئی اس نے اس کے نام کو بدل دیا۔ اب اسے آپ کسی بھی اعتبار سے پانی نہیں کہیں گے۔

دوسری مثال۔ موم......... آپ موم لیں اور اس کا قلم بنالیں۔ دوات بنالیں، لوح بنالیں، مورت بنالیں، کچھ بنالیں۔ جب بنالیں گے تو پھر موم نہیں کہیں گے۔ یہ قلم ہے، یہ قلمدان ہے، یہ دوات ہے، نام بدل جائے گا لیکن جس شے سے وہ چیز بنی وہ ہے موم.........تو جیسے پانی اور موم کی مثال آپ کے سامنے ہے ویسے ہی پوری کائنات۔ یہ صرف صورت گری ہے اور اس کے اندر جو شے ہے وہ ہے ہیولہ۔

بعض انگریزی کی فلاسفی کی ڈکشنریز میں اسے کہتے ہیں primary matter یا substratum۔ ابتدائی مادہ ....عربی میں بھی کہتے ہیں المادۃ الاولیٰ ٥ یا ہیولہ۔ معلوم ہوا کہ ایک چیز ہے اور اس میں صورت گری ہورہی ہے۔ جب تک فلسفہ میں یہ عقیدہ رہے گا ذہن میں توحید نہیں آسکتی، ثنویت باقی رہے گی۔ گویا ایک خدا قدیم ہے بنانے والا، ایک ہیولہ قدیم ہے بننے والا۔ اور یہ صورت گری فرما رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کوئی ہیولہ وجود نہیں رکھتا۔ کچھ ہے تو اس کا ارادہ ہے۔ کیا ہے؟.........بس ارادۂ الٰہی۔

اب چاہے اسے ارادہ کہیں یا مشیّت کہیں ....قران کی ڈکشنری میں مشیّت، فلاسفی کی ڈکشنری میں اور علم کلام کی ڈکشنری میں ارادہ۔

اصطلاح بدلی لیکن لطف معنی ایک ہے، مغزسخن ایک ہے۔ اور یہی صورت ہے کہ جو forces ہیں۔ یعنی gravitational force آپ کہیں، یہ اسرار فطرت میں سے ہے یا نہیں؟ weak nuclear force کہیں یہ اسرار فطرت میں سے ہے یا نہیں؟ electromagnetic force کہیں وہ بھی ہے، strong nuclear force کہیں وہ بھی ہے، اس کے علاوہ جتنی forces آپ تصور کریں محدود تر سطح پر وہ سب ہیں۔ وہ سب آپ کے لئے الگ الگ قوتیں ہیں۔

جب معصوم دعا سکھاتا ہے تو کہتا ہے:

اللهم انی اسئلك بقوتك التی بها تمسك السمآء ان تقعها علی الارض o

اے پروردگار میں تیری اس قوت کا واسطہ دے کر دُعا کر رہا ہوں جس قوت سے تو نے آسمان کو اٹھائے رکھا ہے کہ وہ زمین پر گر نہیں پڑتا۔

پروردگار تیری اس قوت کا واسطہ: بها تمسك السمآء ان تقعها علی الارضo کہ جس قوت سے تو نے آسمان کو آسمان بنائے رکھا ہے اور اس کو بچا رکھا ہے گر پڑنے سے۔ یہ ستارے گر کیوں نہیں جاتے زمین پر اور کبھی کبھی ایک اکیلا گرتا ہے سب کیوں نہیں گرتے؟

اب معلوم ہوا کہ کوئی universal قانون نہیں ہے، اگر ہے تو اس کا ارادہ! جن ستاروں کو چاہے وہاں رکھے جس ستارے کو چاہے زمین پر اتارے نظام کائنات میں کوئی خلل نہیں آتا۔

فطرت کو سمجھیں، دین کو سمجھیں، نیچر کو سمجھیں۔ جب تک سائنسدانوں کی بتائی ہوئی تاریخوں پر غور کرتے رہیں گے ہر معجزہ شک کی زد میں آجائے گا۔

ارے ذرا آپ سوچئے تو سہی؟ یہ forces، یہ balance، یہ زمین کی کشش، دو ستاروں کا balance، وہ کائنات کا توازن، اگر رسولؐ کی انگلیوں کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا تو کائنات نابود ہو جاتی .... اگر آپ چلا رہے ہوتے تو نابود ہو جاتی۔ کائنات تو وہ چلا رہا ہے کہ

بقوتك التی تمسك السمآء ان تقعها علیٰ الارضo

تیری قسم، اس قوت کی قسم جس قوت سے تو نے آسمان کو گر پڑنے سے بچائے رکھا۔ ارے گر پڑتا آسمان مگر کسی نے بچائے رکھا۔

شق القمر سمجھ میں نہیں آتا؟ اور نیچر کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس کے کفش مبارک کی دھول ہے نیچر کی کہکشاں اس کا معجزہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارے شق القمر میں تو علیؑ کا ذکر

بھی ویسے نہیں ہے جیسے ردالشمس میں ہے۔

مصطفےٰؐ نے انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے کر دیئے۔ چاند دو ٹکڑے ہوا۔ کائنات اپنی جگہ قائم رہی اور مصطفےٰؐ نے زانوئے علیؑ پر سر رکھا اور استراحت فرمائی، وحی نازل ہوئی ....آپ اسے اتفاق سمجھتے ہیں؟ ارے بندے کا عمل ہوتا تو اتفاق ہوتا........خدا نے وحی بھیجی یہ بھی اتفاق ہے؟

آپ کو وقت کا شعور ہے خدا کو نہیں معلوم کہ وحی کس وقت بھیجے؟ خدا وحی بھیج رہا ہے، جبرئیلؑ آئے، پیغمبرؐ وحی سماعت فرما رہے ہیں۔ دیر ہوگئی۔ اس دن یہ دیر اس لئے ہوئی کہ بتانا تھا کہ میری وحی جب نازل ہوتی ہے تو کائنات پر سکون طاری ہوجاتا ہے۔ ایک واقعہ سے خدا کی قدرت اور ارادہ کو پہچانو، مصطفےٰؐ کے مرتبے کو پہچانو، علیؑ کی ریاضت کو پہچانو۔

یہ سب شاخ و برگ ہیں ایک نکتۂ علمی کے، علم وارادہ کا رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس کا ارادہ ہے جو قوتوں کی شکل میں ظاہر ہے۔ اس کا ارادہ ہے جو فطرت کی بوقلمونی کی شکل میں ظاہر ہے، وہ جیسا چاہے کرے:

انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول له کن فیکون o (سورۂ یٰسین آیت ۸۲)

''یُرِیدُ'' سمجھو، اَرَادَ سمجھو، اِرادہ سمجھو، علم سمجھو، تب دین بھی سمجھ میں آئے گا، فطرت بھی سمجھ میں آئے گی۔ اور پھر میں نے یہ کیوں عرض کیا تھا کہ کلام کی اصطلاح میں ارادہ ہے، قرآن کی اصطلاح میں مشیّت۔

اب وقت نہیں ہے لیکن میں روایت نہ پڑھ کے آیت تو پڑھوں اور وہ یہ کہ ایک سے زائد مقامات پر پروردگار نے بعض حضرات کو یہ کہا کہ:

وما تشائون الا ان یشاء اللهo

تم کچھ ارادہ ہی نہیں کرتے مگر وہی ارادہ کرتے ہو جو خدا ارادہ کرتا ہے.......... یہ ہیں کون؟........ عام ذہن نے اسے جبر کا فلسفہ سمجھا، ہم نے محمدؐ کے اختیار کو

پہچانا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے ہم تو وہی سوچ سکتے ہیں جو خدا سوچتا ہے۔ ہم تو وہی کر سکتے ہیں جو خدا کرتا ہے۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ o جب خدا چاہے گا وہی تو ہوگا۔ خدا کے بنا چاہے ہوئے ایک پتہ نہیں ہل سکتا تو نعوذ باللہ چور نے چوری کی تو خدا نے چاہا تھا کہ چوری کرے ورنہ کیسے کرتا چوری ؟ کسی نے کوئی گناہ کیا، کوئی قبیح فعل سرزد ہوا تو نعوذ باللہ، خدا نے چاہا تھا۔ یہ ان لوگوں کا پیش کیا ہوا فلسفہ ہے کہ جو جس طرح چاہتے ہیں سیاست میں کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہدایت کا جبرِ عباد سے تعلق نہیں ہے۔ اضطرارِ اولیاء اللہ سے تعلق ہے۔

یہ مصطفےٰؐ ہیں کہ وہی چاہتے ہیں کہ جو خدا چاہتا ہے۔ یہ مرتضیٰؑ ہیں کہ وہی چاہتے ہیں کہ جو خدا چاہتا ہے۔ یہ زہراؑ ہیں کہ وہی چاہتی ہیں کہ جو خدا چاہتا ہے۔ اور اسی لئے جب یہ اس کا چاہا ہوا چاہتی ہیں تو وہ ان کا چاہا ہوا کرتا ہے۔ یہ کہہ دیں بیٹا! تمہارے کپڑے خیاط کے یہاں ہیں وہی ہو کر رہے گا۔

فاطمہؑ اگر حسنینؑ کے لئے کہہ دیں کہ بیٹا کپڑے تمہارے خیاط کے یہاں ہیں تو دوسرے روز خیاط بن کے رضوان آجائے گا اور اگر اپنے بچوں سے زینبؑ کوئی وعدہ کر لیں!

ایام عزا گزر رہے ہیں اس لئے میں فضائل کے چند جملے کم کر کے مصائب کے چند جملے بڑھانا چاہتا ہوں۔ مجھ سے ہر چند کہ مصائب پڑھے نہیں جاتے مگر بعض باتیں استدلالی انداز میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں مقام مصائب میں بھی۔

آپ دیکھیں تو سہی (ارادے اور علم کی بحث ذہن میں رکھیے گا)۔ نبیؐ کا ارادہ، امامؑ کا ارادہ، نبیؐ اور امامؑ کی آغوش میں تربیت پانے والے بالغ ذہن کا ارادہ یعنی خدا طلبی، شہادت طلبی، فردوس طلبی، کوثر کی چاہت۔ بڑوں میں تو سمجھ میں آتی ہے یہ بات۔ مگر دیکھو تو اس گھرانے کے بچوں کا علم کیسا تھا، اس گھرانے کے بچوں کی طلب کیسی تھی۔ اس

گھرانے کے بچوں کا ارادہ کیسا تھا۔ اللہ اکبر!

بچوں کا ارادہ، بچوں کا علم .... لاکھ بہادر کے بچے ہوں۔ بڑی سے بڑی بہادر ماں کی اولاد ہوں مگر بچے بچے ہوتے ہیں۔ بیس ہزار، بقولے تیس ہزار، بقولے پینتیس ہزار اور بقولے ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد فوج لیکن کم سے کم کتنی؟........ کم سے کم پر اکتفا کر لیجئے۔ بیس ہزار۔ کم سے کم ہے۔ سلّمنا کی منزل پر ہوں تسلیم کرتا ہوں۔ بیس ہزار کی فوج اور دو بچے!!

بچے ہی ہیں، اٹھارہ برس کے نہیں ہوئے، پندرہ برس کے نہیں ہوئے، دس سے متجاوز ہیں مگر بچے ہی کہلائیں گے۔ کوئی زرہ جسم پر نہیں آ سکتی، تلوار پوری حمائل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نیچے لیکر گئے، چھوٹی چھوٹی تلواریں لیکر گئے۔ اور اپنے ارادے سے گئے۔ ماں کا ارادہ بھی ہو تو ایسا، بچوں کا ارادہ بھی ہو تو ایسا!

شب بھر زینبؑ اپنے بچوں کو لے کر (کہتی رہیں):

بیٹا کل ماموں پر جان نثار کرنا ہے۔

چھٹے امام نے فرمایا ہے: جب میرے جد پر روؤ تو بلند آواز سے گریہ کرو۔ یہ امام کا ارشاد ہے۔ آداب عزاء معلوم تو ہو پُرسا دے رہے ہیں۔ کس کو؟........

زینبؑ کو پُرسا دینا ہے آج۔ اس کو پُرسا دینا ہے جو خود نہ روسکی، جسے رونے نہ دیا گیا۔ اور جو خود روئی بھی نہیں۔

زینبؑ بڑی صابرہ خاتون کا نام ہے۔ بڑی شجاع خاتون کا نام ہے۔ ہمارے مرثیہ نگاروں نے، ہمارے شاعروں نے ضرورتِ شعری کے تحت بہت سے مقامات پر مضمون آفرینی کی ہے، بلک بلک کے بی بی کے رونے کا تذکرہ ہے، بی بی کے غش کھا کر گرنے کا تذکرہ ہے، لیکن بی بی روئی کہاں! ایک دو مقامات پر روایتوں میں ہے کہ غش کھا کر گریں لیکن آپ تصور تو کریں مدینہ سے نکلنے سے لے کر اور مدینہ پہنچنے تک کتنے مقامات ہیں جہاں کوئی عام عورت ہوتی تو جسم و روح کا رشتہ ختم ہو جاتا مگر یہ زینبؑ کا

استقلال ہے، شجاع زینبؑ ، بہادر زینبؑ ، علیؑ کی بیٹی زینبؑ ۔ شب بھر بچوں کی تربیت کرتی رہیں۔ بیٹا: تمہیں کل جہاد کرنا ہے......... اور صبح عاشورہ سے بچے بیتاب ہیں۔ بار بار آتے ہیں: ماموں میدان کی اجازت دیجئے۔

ہمارے یہاں ترتیب مصائب یہ ہے کہ ہم حضرت علی اکبرؑ کے مصائب بعد میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ، کربلا میں یہ ہے، تاریخوں میں یہ ہے کہ اصحاب نے سب سے پہلے جانیں قربان کیں اور اہل بیت میں سے آقا نے سب سے پہلے حضرت علی اکبرؑ کو بھیجا۔ یہ اس گھرانے کی شان ہے، یہ اس گھرانے کی روایت ہے، یہ اسی گھرانے کا tradition ہے .... سب سے پہلے علی اکبرؑ کو بھیجنا چاہتے تھے مگر اصحاب آ گئے: ہمارے ہوتے ہوئے شبیہ رسولؐ ؟ نہیں آقا یہ نہیں ہوسکتا۔

صحابی گئے اور اس کے بعد اہلبیتؑ کی قربانیاں شروع ہوئیں۔ جب علی اکبرؑ جانے لگے اس وقت بھی آئے ہوں گے یہ بچے: ماموں ارے! پہلے ہمیں بھیج دیجئے۔

حسینؑ بار بار روک لیتے تھے۔ پھر ایک موقع ایسا آیا جب زینبؑ نے ایک مخصوص نگاہ سے بھائی کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں بھیا! کیا، میری قربانی قبول نہ ہوگی؟

حسینؑ نے سر کو جھکایا: بیٹو! جاؤ خدا حافظ۔

عونؑ و محمدؑ گئے۔ بے پناہ جنگ کی۔ دشمن نے لکھا ہے۔ بچوں نے بے پناہ جنگ کی۔ ان نوخیز نوجوانوں نے بے پناہ جنگ کی لیکن ایک وہ لمحہ آیا جب ایک بیٹے نے کہا کہ السلام علیک یا عماہ، السلام علیک یا ابا عبداللہ۔

چچا عباس آخری سلام، ماموں آقا، امام آخری سلام۔

اِدھر ایک نے آواز دی، اُدھر دوسرے کی آواز آئی۔ حسینؑ میدان میں گئے۔ بچوں کو اٹھایا۔ ابھی سہارا دینے والے عباسؑ ہیں۔ دو جنازے ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔ مگر خیمے کا منظر بدلا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی لاشہ آتا تھا بیبیاں درِخیمہ پر ہوتی تھیں اور سب سے آگے زینبؑ ہوتی تھیں۔

صحابی کا لاشہ آتا تھا وہ در خیمہ تک لا کے دوسرے خیمے میں پہنچادیا جاتا تھا۔ اہل بیت میں سے کسی کا لاشہ آتا تھا خیمہ کے اندر آتا تھا اور زینبؑ سب سے آگے ہوتی تھی۔ جب عونؑ و محمدؑ کے لاشے آئے سب کے چہرے نظر آئے، زینبؑ نظر نہیں آئیں۔

حسینؑ نے کہا: ربابؓ زینبؑ کو بلاؤ۔ خود امامؑ دونوں بچوں کے جنازوں کے درمیان لیٹ گئے کبھی عونؑ کے رخسار پر سر رکھتے کبھی محمدؑ کے رخسار پر:

بیٹا تم نے جان نثار کی، تم نے حق ادا کر دیا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون رضا بقضائہ و تسلیماً لامرہ٥

فسیعلمون ظلموا ای منقلبٍ ینقلبون.

مجلس پنجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! قرآن حکیم کے سورۂ مبارکہ روم کی تیسویں آیت ہماری گفتگو کا قرآنی سرنامہ ہے اس میں ارشاد الٰہی ہے کہ:

فاقم وجهك للدين حنيفاo تم بغیر کسی انحراف کے اپنا رخ دین کی طرف کرلو۔

فطرت الله التی فطر الناس علیهاo یہ وہ فطرت الٰہیہ ہے جس پر اللہ نے لوگوں کی فطرتوں کو ڈھالا ہے۔

لا تبدیل لخلق اللهo اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہے۔

ذلك الدین القیمo یہی زندگی ساز دین ہے۔

ولکن اکثر الناس لا یعلمونo لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

میں نے آپ کے سامنے اس آیت کی تلاوت تقریباً پندرہ مرتبہ کی ہے۔ سال

گزشتہ کرتا رہا اور اس مرتبہ اور خود آپ نے کتنی مرتبہ اس کی تلاوت کی ہوگی۔

ماشاء اللہ علماء کرام کا مجمع ہوگیا ہے۔ ایسے مواقع پر میری طالبعلمانہ طبیعت کے تقاضے بدل جاتے ہیں اور پھر اگر ہمارے کسی غیر حوزوی دوست کو گلہ ہو جائے تو اس کے لئے معذرت قابل قبول ہونی چاہیے۔ جناب حجّت الاسلام و المسلمین زکی باقری صاحب اور جناب مولانا سجاد صاحب اور برادران عزیز یہ حجج الاسلام اور خطبائے کرام تشریف فرما ہیں۔ اس لئے ان کے سامنے جو مطالب میں گزارش کرتا آرہا ہوں ان مطالب کی داد آپ تو دیتے ہی ہیں۔ اب ان کی موجودگی میں سلسلۂ فکر آگے بڑھے گا۔

آپ نے آیت کے مزاج پر غور فرمایا؟ آیت میں چار فقرے ہیں ایک کے بعد ایک۔ ایک فقرہ میں دین کا لفظ آتا ہے تو دوسرے میں فطرت کا، ایک میں خلق کا تذکرہ ہوتا ہے تو پھر دوسرے میں دین کا۔ فاقم وجهك للدين ..... فطرت الله ...... لا تبديل لخلق الله...... ذٰلك الدين ایک جگہ فطرت کا لفظ استعمال ہوا پھر دین کا لفظ استعمال ہوا پھر دین کا لفظ استعمال ہوا پھر فطرت کا۔ پھر خلق کا لفظ استعمال ہوا پھر دین کا۔

آپ نے مزاج آیت کو سمجھا؟........ اسی لئے تو میری گفتگو بھی شروع ہوتی ہے فطرت کے مناظر کے مطالعے سے اور ختم ہوتی ہے جا کر پروردگار عالم کے بہترین مظاہر پر۔ اور اس میں میرا کوئی خاص ارادہ شامل نہیں ہوتا۔

کل عِلم اور ارادہ تک گفتگو پہنچی کہ عِلم اور ارادے میں ایک خاص ربط ہے۔ ارادہ فرعِ عِلم ہے، تعبیرات مختلف ہوسکتے ہیں۔ تعبیریں بدل سکتی ہیں۔ تعبیریں تو علوم کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ میں پرہیز کرتا ہوں اس بات سے کہ اپنی ہی کہی ہوئی پچھلی باتوں کو دہراؤں لیکن کبھی کبھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی مثال کو دہرا کر کسی نئی بات کو آگے بڑھانے میں مدد مل جائے۔ تو میں نے کبھی مثال دی تھی کہ شے ایک ہوتی ہے لیکن جب زاویۂ نظر بدلتا ہے تو اس کے بارے میں تعریف بدل جاتی ہے۔ اس کی definition بدل جاتی ہے اور اس سے دوسرے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ بھی تبدیل

ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ مثال شرعی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر دی تھی اس لئے پھر اسی مثال کو دہراؤں۔ جن حضرات کے ذہنوں میں ہے ان کے لئے مجھے تو نہیں کہنا چاہئے کیونکہ میرے جملے ہیں کہ قند مکرر ہوں گے لیکن بہرحال کلفت نہ ہوگی۔

میں نے مثال دی تھی خاک کی۔ آپ ایک مٹھی خاک اٹھالیں اور کسی scientist کے پاس چلے جائیں۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ کیا ہے؟...... کہے گا: matter ہے۔ اگر کیمسٹری سے اس کا زیادہ ذوق ہے تو بھی لہجہ بدل جائے گا کہے گا کہ یہ مکسچر ہے لوگ خواہ مخواہ کمپاؤنڈ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ کوئی مستقل element نہیں بہت سے elements کا مجموعہ ہے، اس میں کوئی خاص توازن بھی نہیں ہے، matter ہے اور اس وقت یہ solid form میں ہے۔ اور اگر وہ فزکس کا آدمی ہے تو اُس کے describe کرنے کے انداز میں اور تبدیلی ہوگی۔

دونوں سائنس کے ہیں مگر ایک شخص اپنے زاویے سے اس کی تعریف پیش کرے گا اور دوسرا شخص دوسرے زاویے سے تعریف کرے گا، اور اگر آپ کسی مولوی کے پاس آگئے، کسی فقیہ کے پاس لے کر آگئے اسی خاک کو تو وہ کہے گا یہ طہور ہے، احد الطہورین ہے۔ جب پانی میسر نہ ہو تو یہ طہارت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

یہ وہی خاک ہے definition بدلتی چلی گئی، عنوان بدلتا چلا گیا۔ شے ایک ہوتی ہے خارج میں۔ میں نے جو عرض کیا کہ ارادہ فرعِ علم ہے۔ ہوسکتا ہے کسی مخصوص فن میں یہ کہا جائے کہ ارادہ عین عِلم ہے، کہیں کہا جائے ارادہ فرعِ عِلم ہے، کہیں کہا جائے ارادہ نتیجۂ عِلم ہے۔ تو عینِ عِلم، فرعِ عِلم، نتیجۂ عِلم ان سب میں فرق تو ہوتا چلا جائے گا۔ مگر ارادہ ارادہ رہے گا اور علم عِلم۔ دونوں کے اعتباری ضبط و امتزاج میں، تغایر میں، ربط میں، امتزاج میں، تعلق میں، تعبیر کا فرق ہوگا لیکن وہ شے اپنی جگہ ویسی ہی رہے گی۔

میری کوشش یہ ہے کہ گفتگو قدم بقدم آگے بڑھے۔ تا کہ اس سلسلہ بیانات میں کم

از کم کسی ایک شعبۂ فکر و نظر میں کوئی ایک مکمل بات کہی جا سکے۔ جو لوگ علمی ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی ایک مکمل بات کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ پریشاں نظری میں مبتلا رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ ہماری فکر منظّم ہونا چاہئے، نظام فکر ہونا چاہئے، پراگندگی فکر میں نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے نکتہ بہ نکتہ اور قدم بقدم گفتگو آگے بڑھے گی۔

بات فطرت شناسی کی ہے لیکن فطرت کا سب سے بڑا راز یہ عِلم ہے، سب سے بڑا جمال یہ عِلم ہے، سب سے بڑا جلال یہ عِلم ہے اور آپ خود ساتھ دے رہے ہیں، اس فکری سفر میں۔ کل ہم بہت کچھ اس منزل تک پہنچے کہ عِلم اور ارادہ کے رشتے کو سمجھا اور ہم نے جانا کہ عام حالات میں ارادے کے دو سرے ہیں ایک کا عِلم سے تعلق ہے اور ایک کا عمل سے۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھ جائیں۔

عِلم کے بھی مراتب ہیں۔ اور ارادے کے بھی مراتب ہیں۔ ایک بار لفظِ ارادہ کہہ کر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ علمی دنیا میں اور زندگی کے بیتے ہوئے ماحول میں کوئی بات ختم نہیں ہو جاتی، کوئی بات کہیں پر ٹھہرتی نہیں ہے۔ اگر ٹھہر جائے تو اسے بات کا ٹھہرنا نہیں فنا ہو جانا کہتے ہیں، ختم ہو جاتی ہے بات۔ بات اگر مسلسل جاری رہے، کبھی وہ زندگی سے جڑی ہوئی بات ہے، کبھی وہ عِلم سے جُڑی ہوئی بات ہے۔

عِلم اور حیات میں خود تغایر اور امتیاز اعتباری ہے ورنہ حیات عین عِلم ہے اور عِلم عین حیات۔ جہاں زندگی نہیں ہوگی وہاں علم پایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہاں اطلاق علم نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے پہلے روز سے جو گفتگو ہو رہی ہے پتھر کو پتھر کہتے ہیں علم کیوں نہیں کہتے۔ جب پتھر کی ماہیت جُزو شعورِ انسانی بن جاتی ہے تو وہ شعورِ انسانی زندہ حقیقت ہے پھر وہ ماہیت علم کہلاتی ہے، لیکن جب تک وہ ماہیت خارج میں ہے، حالانکہ وجود رکھتی ہے۔ (لیکن علم نہیں کہلاتی)۔

ہو سکتا ہے کہ بات آپ کے لئے قدرے مشکل محسوس ہو رہی ہو۔ لیکن دیکھئے وجود اور ماہیت دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں یہ

کلمات مگر یہ جس فن سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ایک زمانے تک یہی بحث رہی کہ وجود اصیل ہے یا ماہیت۔ اصیل کے کیا معنی ہیں یہ بھی عرض کردیتا ہوں اور ان دونوں میں کیا فرق ہے وہ بھی عرض کردیتا ہوں۔ اور یہ عرض کرنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ کسی اور اسٹیج کی تقریر نہیں ہے، یہ کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں ہے۔ آپ کے وقت عزیز کو تلف کرنا مقصود نہیں ہے۔ جو بھی فرشِ عزائے حسینؑ پر آتا ہے اس کا وقت ہرگز تلف نہیں ہوتا۔ اُدھر سے کچھ نہ کچھ عطا ہوتی ہے مگر اِدھر سے طلب بھی تو ہونی چاہیئے۔

دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے فکری مسائل ہیں ان کو حل کرنے کے لئے یہ منبر کس قدر کارآمد رہا ہے اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کسے ہوگا۔ اس منبر نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے۔ عِلم کا چراغ جلتا رہا ہے ہمیشہ اسی منبر پر۔ کہیں بھی چراغِ عِلم، ہوائے نفسِ انسانی کی زد میں آ کر گُل ہوسکتا ہے مگر منبر پر یہ چراغ گُل نہیں ہوسکتا۔

تو وجود و ماہیت، وجود و ماہیت یہ کلمات آپ سنتے ہیں۔ دیکھئے ماہیت ایک امرِ انتزاعی ہے، وجود ایک حقیقی شے ہے۔ یعنی کیا؟......... آپ نے لفظِ انسان کہا۔ جب کہا انسان تو آپ کے ذہن میں ایک انسان کا تصور پیدا ہوگیا۔ یہ جو پیدا ہوا یہ ماہیت ہے اور وجود کا ایک ضعیف رتبہ ہے مگر یہ جو انسان خارج میں بیٹھا ہے یہ وجود ہے۔ آثار وجود میں پائے جاتے ہیں صرف ماہیت میں نہیں، اسی کے معنی ہیں اصالت کے۔ یعنی آپ نے آگ کا تصور کیا۔ وہ جو تصور ہے آگ کا کہ ایک شے ذہن میں آئی وہ ماہیت ہے لیکن اس سے کوئی شے جل نہیں سکتی۔ آگ کا کام ہے جلانا۔ جلائے گی کون سی آگ کہ جس کا وجود خارج میں ہے۔ وجود میں آثار ہیں۔ ماہیت میں وہ آثار نہیں ہیں کہ جو وجود میں ہیں۔ تو آثار تو پتھر میں ہیں وہ وجود ہے جو خارج میں ہے۔ مگر جو ذہن انسانی کا جُز بنا وہ ماہیت ہے۔ اُس کے باوجود آپ نے اس ماہیت کو اور اس وجودِ ذہن کو عِلم کہا چونکہ حیات سے رشتہ جڑ گیا۔

جب ماہیتوں کا رشتہ حیات سے جڑ جائے تو انہیں عِلم کہا جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا

میں تمام علم مجازی ہیں اور امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں فرمایا:

نحن عیش العلم ٥ عِلم کی زندگی ہم ہیں۔

اب آپ جب نہج البلاغہ میں یہ جملہ پڑھیں گے کہ مولا نے کہا:

نحن عیش العلم ٥ ہم عِلم کی زندگی ہیں۔ یعنی ہم سے جدا رہے گا تو عِلم عِلم نہیں رہے گا۔ عِلم اعتبار ہی اس وقت پائے گا جب حق سے جڑ جائے، ہم سے وابستہ ہو جائے۔ اس لئے کہ اس کائنات میں سب سے ارفع رتبۂ حیات انسان کا ہے اور انسان سے بھی ارفع رتبہ حیات حضراتِ محمدؐ و آل محمدؑ کا ہے۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ عِلم کے بھی رتبے ہیں جیسے حیات کے رُتبے ہیں اور ایسے ہی ارادے کے رُتبے ہیں۔ آج صرف ارادے پر غور کرنا ہے۔ اور بات شروع کریں اپنے ارادے سے اور جائزہ لیں کہ آپ کے ارادے کی کتنی قسمیں، آپ کے ارادے کے کتنے مراتب ہیں، کتنی سطحیں ہیں آپ کے ارادے کی۔ قدم بقدم آگے بڑھیں۔

فطرت کی اساس توحید ہے۔ دین کی اساس توحید ہے۔ توحید، تخیل یا واہمہ نہیں ہے۔ توحید ایک وجودی حقیقت ہے اور اس لئے اس کائنات کا اگر کوئی ایک بھی سچا اور حقیقی راز مل گیا تو سارے اسرار کُھلتے چلے جاتے ہیں اور اگر ایک راز بھی سمجھ میں نہیں آیا تو پھر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ذہن ایک گنبد تاریک بنا رہتا ہے لیکن اگر کوئی ایک راز بھی سمجھ میں آ گیا، ایک حقیقی نکتہ بھی سمجھ میں آ گیا تو چونکہ وجودی حقیقت ہے توحید، وہ ایک جو سمجھ میں آیا تو سب کو سمجھاتا چلا جائے گا۔

ایک مسئلہ سمجھ میں آ گیا تو سارے مسئلے سمجھ میں آتے چلے جائیں گے اور اگر ایک بھی مسئلہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کوئی بھی بنیادی مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ جیسے مسائل کی بات ہے ویسے ہی وجودات کی بات ہے۔ خدا کی قسم اگر مجھ سے کوئی کہتا ہے کہ علیؑ سمجھ میں نہیں آئے تو میں سمجھ جاتا ہوں ابھی مصطفیٰؐ بھی سمجھ میں نہیں آئے۔

جب کوئی کہتا ہے: خدا سمجھ میں نہیں آیا۔ جب بھی میں سمجھ جاتا ہوں کہ مصطفیؐ سمجھ میں نہیں آئے۔ ارے مصطفیؐ اس برزخی حقیقت کا نام ہے کہ مصطفیؐ کو سمجھ لو تو خدا سمجھ میں آجائے گا۔ مصطفیؐ کو سمجھو لو تو پھر وہ سلسلۂ طیّبہ سمجھ میں آجائے گا جس میں ہر فرد کو نفس مصطفیؐ ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ زبان سے ادّعا کافی نہیں ہے۔

بہ مصطفیؐ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

مصطفیؐ تک پہنچ جاؤ کہ عین دین وہی ہیں، کُلِّ دین وہی ہیں، اگر تم مصطفیؐ تک نہیں پہنچے تو بولہبی ہے۔ اب جہاں بھی مصطفویت نظر نہ آئے وہاں فیصلہ کیا آپ کے حکیم اسلام نے کہ جب مصطفیؐ نظر نہیں آئیں گے تو پھر وہاں بولہبی ہوگی یعنی بوترابی نہیں ہوسکتی۔

بوترابی مزاج وہیں ہوگا، مرتضوی مزاج وہیں ہوگا کہ جہاں مصطفوی شعور ہوگا اور اگر مصطفوی شعور نہیں ہوگا تو بولہبی ہوگی۔ نکتہ یہی ذہن میں رہے کہ ایک ذات سمجھ میں آجائے تو سب سمجھ میں آجائیں گے۔ ایک نکتہ اگر منکشف ہوجائے تو سارا عالمِ فطرت منکشف ہوجائے گا۔

ایک نظامِ فکر لے کر جائیں اس فرشِ عزا سے اور اس منبر سے اور ایک بات کو اگر سمجھ لیں تو اس سے نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے بڑے بڑے شبہات، دوسرے بڑے بڑے شکوک، دوسرے بڑے بڑے فکری مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ توحید کے باب میں، عدل کے باب میں، خیر کے باب میں، شر کے باب میں، نظام احسن حیات کے باب میں........

ابھی ہم ایران سے آرہے ہیں وہاں بہت زبردست زلزلہ آگیا اور ہمارے یہاں کے ایک بہت مشہور انگریزی کے جرنلسٹ اور ادیب اور دانشور نے (دنیاوی اعتبار سے) مضمون لکھ دیا۔ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ میں حوالہ دے رہا ہوں خشونت سنگھ، سبھی نے نام سنا ہوگا، انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں۔ لکھتے ہیں، جو ذہن میں آتا ہے لکھتے

ہیں۔ بظاہر تو وہ نثر لکھتے ہیں مگر مزاج ان کا شاعرانہ ہے۔

یعنی: انھم فی کل وادٍ یھیمون٥ (سورہٴ شعراء آیت ۲۲۵)

ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کبھی کوئی کام کی بات لکھ دی کبھی کوئی بالکل بے کار کی بات لکھ دی۔ تو انہوں نے کیا لکھا ؟.......... کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے (نعوذ باللہ) کہ ہم خدا کو کہیں مِس (miss) کر رہے ہیں۔ خدا نہیں ہے۔

دوسرے آرٹیکل میں لکھا نعوذ باللہ کہ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا سو جاتا ہے، خدا اونگھ جاتا ہے، جب ذہن اور نفس پاکیزہ نہ ہو تو ایسے ہی گستاخانہ کلمے زبانوں سے خارج ہوتے ہیں۔

بات کہاں تک پہنچ گئی؟......... بات یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ زلزلے آتے کیوں ہیں؟ جانیں کیوں چلی جاتی ہیں؟ یہ شَرّ کا وجود کیوں ہے ؟ (کتنے بڑے فکری مسائل چھڑ گئے)۔ کل ہی تقریر میں کہیں پہ میں نے عرض کیا تھا کہ عام طور پر جو جبر کا فلسفہ دینے والے حضرات ہیں، وہ یہی تو سمجھاتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے سب مرضی معبود سے ہو رہا ہے۔ ملحد میں اور اس طرح کی فکر رکھنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور کافر و ملحد میں اور ایک اس طرح کی فکر رکھنے والے (میں تو بہت محتاط رہنے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی)....... لفظِ نام نہاد بھی ہم لوگ منبر سے استعمال نہیں کیا کرتے مگر کرنا پڑتا ہے۔ جیسے نام نہاد توحید کا کلمہ پڑھنے والے کہ جو شَرّ کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بھی یہاں ہو رہا ہے اسی کے ارادے سے ہو رہا ہے۔

ایک طرف یہ فکر اور ایک طرف یہ کہ وہ ہے ہی نہیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود بخود ہو رہا ہے۔ مادی دنیا ہے اور بس۔

تو ایک طرف ملحدانہ فکر ہے اور ایک طرف ایسی مواحدانہ فکر ہے کہ جو ملحدانہ سے زیادہ رکیک اور شر انگیز ہے تو جناب والا یہ تمام بڑے سنگین زندگی کے مسائل ہیں اور ہمارے کبھی کبھی معصوم بچے۔ اب معصوم بھی اس معنٰی میں نہیں ..... آپ تو لفظوں کے

مزاج کو جانتے ہیں۔ کبھی آپ کہتے ہیں حضرت !........ کبھی کہتے ہیں حضرت۔ کبھی کہتے ہیں معصوم، کبھی کہتے ہیں معصوم۔

کبھی معصوم اسے کہتے ہیں جو علمِ لدنی رکھتا ہے کبھی معصوم اسے کہتے ہیں جو مطلقاً نادانی کی باتیں کرتا ہے۔ زبان پر قابو ہے نا! کبھی حضرت اسے کہتے ہیں جو ہر وقت حاضر و ناظر ہوتا ہے، کبھی حضرت اسے کہتے ہیں کہ جو ہمیشہ غائب رہتا ہے۔ کبھی آپ احترام میں کہتے ہیں جناب! علماء کے لئے کہتے ہیں جناب تشریف لا رہے ہیں اور کبھی کہتے ہیں: اچھا جناب آ گئے۔ لفظوں کا استعمال ہے۔

گزارش یہ کر رہا ہوں کہ یہ جتنے مسائل ہیں بڑے بڑے، ہمارے نادان بچے، معصوم بچے اور اس لحاظ سے یقیناً معصوم ہیں کہ ان پر یلغار ہو رہی ہے مغرب میں اور مغرب کا نام ہمیشہ کیوں لیا جائے؟......... یہ میری عدل پسند طبیعت کے خلاف ہے،

مشرق میں کونسا شر نہیں ہے کہ جو مغرب میں ہے؟ اور مغرب میں کونسا خیر ہے جو مشرق میں نہیں ہے۔ خیر و شر جغرافیائی حدود میں منقسم نہیں ہیں۔ ہر قسم کے تعصبات سے بلند ہو جائیں۔ نہ سمتوں کا تعصّب ہو، نہ نسلوں کا تعصب ہو۔ نہ ملکوں کا تعصب ہو تب آپ انسان کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ اور جب اس سے بھی بلند تر ہوں گے تب آپ مسلمان کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ ہیں کہاں؟.........

جب تک غرورِ اسلامی رہے گا مسلمان نہیں کہلائیں گے۔ اسلام آپ کو غرور نہیں دیتا جرأت دیتا ہے۔ اسلام تو عاجزی سکھاتا ہے۔ خدا کے سامنے عاجزی کرو، سَرنگوں ہو جاؤ۔ عاجزی اور غرور دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو پروردگار کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکا اس کے ذہن میں غرور کہاں سے آ سکتا ہے، تکبر کہاں سے آ سکتا ہے۔ تکبر آئے گا تو اسلام رخصت ہو جائے گا۔ پہلے ہی دن شیطان اور آدمؑ کے قصے میں یہی واقعہ بیان ہوا تھا۔

خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے۔ تو آپ کا ارادہ آپ کا اختیار، اپنے ارادے سے خم کیجئے اپنی جبیں، اپنے اختیار سے خم کیجئے اپنی جبین اس پروردگار کے سامنے۔ یعنی پھر آپ

کے پاس انتخاب کی راہ نہیں ہے جب اس کے احکام سامنے آجائیں۔

کہنے والے دو ہیں........نعوذ باللہ.....نعوذ باللہ..... بات آ گئی ہے۔ دیکھئے عجیب سا جملہ کہہ رہا ہوں۔ میں تو ہمیشہ سے عجیب تر کہتا رہتا ہوں۔ آپ کا ظرف ہے کہ آپ یاد رکھتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔

توحید کا کلمہ بت پرستوں کے پاس بھی ہے، توحید کا کلمہ ہندوستان کے بت پرستوں کے پاس بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خالق کائنات ایک ہی ہے اور وہ نراکا رہے یعنی اس کی شکل وصورت نہیں ہے، وہ جسم نہیں رکھتا وہ جسمانیات اور مکانیات اور زمانیات سے بالا ہے یعنی توحید کا تصور ہے مگر توحید عملاً نہیں ہے۔ یہی حشر ملت اسلامیہ کا ہوتا، توحید کا کلمہ ہوتا مگر توحید نہ رہتی۔ توحید ہے تو علیؑ کے دم سے ہے۔

یہ جملہ نہ جانے کتنی بار quote کیا گیا ہے اور quote کیا جاتا رہے گا کہ ''میں خدا کی عبادت کرتا ہوں کہ وہ اہل ہے عبادت کا۔ میں نہ جہنم کے خوف سے نہ جنت کے لالچ میں عبادت کرتا ہوں۔''

عبادت کا اعلان ہے۔ شرک کی نفی ہے، کفر کے مقابلے میں بالکل واضح نظریہ ہے۔ لیکن نظریہ یہ نہیں ہے کہ معبود تو جب حکم دے گا اپنی ذات کو سجدہ کرنے کے لئے تب تو میں سجدہ کروں گا اور اگر تو نے کہا کہ ان کی اطاعت کرو تو نہیں کروں گا۔ معبود میں یہ جبیں تیری نذر کر چکا، جہاں چاہے رکھ دے، جہاں بھی یہ پیشانی تیرے حکم سے رکھی جائے گی وہ تیرا ہی سجدہ کہلائے گا۔

اور دوسری طرف یہ فیصلہ ہوا کہ میں تجھے تو سجدہ کروں گا لیکن اگر تو کہے بھی کہ انہیں سجدہ کر تو نہیں کروں گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سر تسلیم اس کے آگے نہیں جھکا یا اپنی انا اور اپنے ارادے کی پرستش ہو رہی ہے۔

یہاں تک بات آ گئی ہے کہ جب خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو پھر غرور و تکبر کا کوئی شائبہ نہیں ہے، پھر تعصّبات کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس دنیا میں بہت سے لوگ مجھے ملے، دل کے نیک، کردار کے نیک، ذہن کے نیک، حقیقت سامنے منکشف ہے زبان سے نہیں کہتے کیوں ؟...... اِن کی وجہ سے نہیں کہتے۔ کہ اگر آج میں نے یہ جملہ کہہ دیا کل یہ میرا مذاق اڑائیں گے اس لئے میں نہیں پڑھوں گا۔ (ساتھ دے رہے ہیں آپ حضرات! سب واقعی سب سمجھ گئے)۔

میں نے بعض حضرات سے عرض کیا دیکھئے آج روئے زمین پر کوئی ایسی حکومت نہیں ہے کہ جو کہے کہ پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھوگے تو سر قلم کردیا جائے گا۔ کوئی حکومت ایسی ہے کہ اگر تم نے علیؑ ابن ابی طالب سے محبت کا اعلان کیا تو تمہیں سزا دی جائے گی؟........ نہیں ہے نا! پہلے تھیں حکومتیں ایسی۔

ایسی حکومتیں تاریخ میں گزری ہیں کہ جہاں علیؑ کا نام رکھ لینے پر سر قلم کردیا جاتا تھا۔ محبت امیر المومنینؑ کا اعلان نہیں کرسکتا تھا انسان ۔ اگر اس وقت یہ بات کہی جاتی اور اسی لئے ایک جملہ کہہ رہا ہوں......... سوچئے اور تحقیق کیجئے کہ عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جو متّقی تھے وہ تقیے میں گزر گئے۔ یعنی جب گھر پر ہوتے تھے تو علیؑ کا ذکر کرتے تھے، اپنی اولاد کو علیؑ کی محبت کا درس دیتے تھے، جب دربار میں جاتے تھے تو خاموش رہتے تھے۔ یہ خاموشی تقّیہ نہیں ہے تو کیا ہے۔ کیوں؟ خداوند عالم نے قران مجید میں اجازت دی ہے، حکم دیا ہے تقّیہ کا کہ اگر جان بچانی ہو تو پھر یہ تدبیر ہے۔ اب آج ایسی کوئی حکومت نہیں ہے۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ تاریخ پڑھیں اور ذہن جس چیز کو قبول کرلے، عقل جس چیز کو باور کرلے اسے زبان سے کہیئے۔

میں نے دنیا میں بہت سفر کیا ہے، امریکہ جیسے آزاد ملک میں جو ہر طرح سے آزاد ہے کوئی پابندی نہیں ۔ (یہ نہ سمجھئے یہیں کہہ رہا ہوں، میں امریکہ جاتا ہوں وہاں بھی ایسے ہی گفتگو کرتا ہوں) وہاں بھی ایسے افراد ہیں کہ جو مجھے ملے کہنے لگے یہ حقیقت تو میرے سامنے ہے، یہ خدا کا حکم، مصطفیٰؐ کا حکم، یہ سچائی ہے تاریخ کی مگر......... اگر میں آج اعلان کردیتا ہوں تو میری برادری کے لوگ ، یا میرے عزیز میرے اقرباء یا میرے رشتے

دار وہ میرا مذاق بہت اڑائیں گے، ہنسیں گے، طعنہ دیں گے، طنز کریں گے۔

''نیزہ تو نہیں چبھوئیں گے؟''

''نہیں''۔

''تلوار تو نہیں لگائیں گے؟''

''نہیں''۔

''سر تو نہیں قلم ہوگا؟''

''نہیں''۔

''جملہ کہیں گے نا!......... ارے خدا کی راہ میں اور حق کی راہ میں ایک جملہ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟........ رسولؐ کا زمانہ ہوتا تو بدر میں کفار کے نیزے کیسے برداشت کرتے؟''

مسئلہ کیا ہے؟ دوسروں کے جملوں کی اہمیت کیوں ہے؟......... اصل میں اہمیت اپنی انا کی ہے۔ جملوں سے انا مجروح ہوتی ہے۔ جسم تو نہیں ہوتا مجروح؟

زندگی کے ہر مسئلہ میں خودداری اچھی ہے مگر حق کے باب میں، باطل کی طرف داری میں خودداری سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔

گفتگو کہیں سے کہیں بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن میں جس نکتہ تک لانا چاہ رہا تھا وہ نکتہ اگر آج ادھورا رہ گیا تو کل مکمل ہوگا۔

گزارش کررہا تھا کہ یہ منزل بھی کب آتی ہے کہ انسان کا علم بھی بہرحال ناقص ہو اور ارادہ بھی کمزور۔ انا آپ کی حق پسندی پر غالب کیوں ہے اس لئے کہ کہیں نہ کہیں شک کا علم بھی نفس رکھتا ہے۔ اور حق کے باب میں جو آپ کا ارادہ ہے وہ بھی کمزور ہے۔

درمیان میں جو بات عرض کررہا تھا کہ یہ جو مشرق اور مغرب سے یلغار ہورہی ہے اور جو بات خشونت سنگھ نے کہی وہ بات ہمارے نوجوان بھی کہتے ہیں۔

آخر معذور لوگ کیوں پیدا ہوتے ہیں، معلول لوگ کیوں پیدا ہوتے ہیں

disabled بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ خدا پہلے ہی نابود کیوں نہیں کر دیتا، غریبوں کو جلاتا کیوں ہے مار کیوں نہیں ڈالتا۔ ایک غریب بیچارہ اپنی تین وقت کی روزی نہیں کماپاتا تو اسے کیوں زندگی دے رکھی ہے خدا نے ؟ یعنی جتنے اعتراضات ہیں وہ ارادۂ الٰہی پر۔ زلزلہ کیوں آ گیا۔ یعنی جتنے بھی شر سے متعلق مسائل ہیں (مسئلہ بہت سنگین ہے، بہت اہم ہے۔) میں نے کہا ایک مکمل نظام فکر لے کر جائیے۔ اگر آپ اپنے نفس کی روشنی میں، اپنے وجود کی روشنی میں حقیقتِ علم و ارادہ کو سمجھ گئے تو پورا ایک نظام فکر مل جائے گا، ایک school of thought مل جائے گا، ایک سسٹم مل جائے گا آپ کو اور وہ یہ ہے کہ آپ پہلے اپنے ارادے کی قسموں کو پہچانیں۔

آپ کے پاس بھی ارادہ ہے نا! یہ تو ارادہ کی ایک سطح ہے....

آپ نے کہا: خیال ہے ہلکا سا کہ میں اگلے مہینے انڈیا چلا جاؤں ....

دونوں ملکوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں، خدا اور بہتر بنائے۔ خدا پورے کرۂ ارض پر عافیت کی فضا قائم کرے۔ اگر ہم امن کے خواہاں نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا۔ تو ایک خیال ہے کہ میں انڈیا چلا جاؤں۔

یہ لفظ خیال جو آپ نے استعمال کیا یہاں پر وہ اس علمی اصطلاح میں نہیں ہے جو حواس خمسہ باطنی ہے۔ یہ ارادہ کی بہت کمزور سطح ہے، ارادہ کی کمزور ترین سطح ہے، خیال ہے ایک کہ شائد چلا جاؤں۔

اور پھر آپ نے دوسرے موقع پر کہا کہ وہ اب وہ خیال ذرا میرا محکم ہو گیا ہے۔ یعنی خود آپ کے ارادے میں ذرا ترقی ہوگئی۔ ارادہ مضبوط ہو گیا اور اس کے بعد آپ نے خیال اور محکم کی دو لفظیں ہٹا دیں اور کہا: میرا ارادہ ہے میں اگلے ہفتے جارہا ہوں۔

اور تیسری منزل ہے کہ آپ نے ارادہ کی جگہ لفظ عزم استعمال کیا۔ عزم۔ کوئی حرف مشترک نہیں ہے وہاں الف، رے، الف، دال، ہے۔ ارادہ۔ یہاں عین، زے، میم۔ مگر یہ مراتبِ ارادۂ انسانی کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب مضبوط ترین ارادہ ہوا تو آپ نے

اسے عزم کہا۔ اولوالعزم پیغمبر کسے کہتے ہیں بعد میں سمجھئے گا پہلے اپنے عزم کو سمجھئے۔

آپ کی فرہنگ میں آپ کی ڈکشنری میں ایک لفظ ''تمنا'' بھی ہے۔ میری تمنا زندگی بھر رہی کہ ایسا ہوجاتا۔ تمنا سے بھی پہلے ایک چیز ہے۔ حسرت رہ گئی دل میں۔ ایک لفظ اور ہے آرزو۔

آرزو، تمنا، حسرت، خیال، مستحکم خیال، عزم، یہ جتنے الفاظ ہیں ہر لفظ آپ کے ارادے کی کسی سطح کو ظاہر کررہا ہے۔

ارادے کے باب میں ایک مثال اور۔ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ نے بیٹے کو تمام وسائل دیئے۔ ذہین بیٹا ہے، صحت مند ہے، آپ نے اس کی تربیت میں کوئی کمی نہیں کی (پیغام بھی ہے اس میں) اور اسے مختلف علوم اور صلاحیتوں کی مہارت دے دی۔ میرے نوجوان اور دانشمند اور دانش جو ساتھی اور دوست سنیں یہ دور وہ نہیں ہے کہ کسی ایک فرد سے وابستہ ہوکر آپ جی لیں۔ آپ کو اللہ نے گونا گوں صلاحیتیں دی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیجئے، زیادہ سے زیادہ skills develope کیجئے، زیادہ سے زیادہ آپ کی ذہنی faculties صحت مند اور نشوونما یافتہ ہونی چاہئیں، جب آپ زندگی کے کارزار میں آگے بڑھیں گے۔ تساہل سے کام نہ لیجئے۔ سہل پسندی اور سہل انگاری کو زندگی میں راہ نہ دیجئے ورنہ انسانی سطح سے زندگی گرجائے گی۔ آپ کو ایک کمزور خیال کا انسان نہیں اولوالعزم ارادے کا انسان ہونا چاہئے۔

گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک اچھے، لائق، ہوش مند، باتدبیر ماں باپ نے اپنے بیٹے کو تمام صلاحیتیں دے دیں۔ کمپیوٹر بھی خوب جانتا ہے، زبانیں بھی جانتا ہے، قانون بھی پڑھادیا اور اکاؤنٹس بھی پڑھادیا۔ مختلف صلاحیتیں دے دیں۔ اب دو تین سرکاری نظام ہیں اور ان کے ٹیسٹ ہیں سب برابر کے درجے ہیں۔ صلاحیتیں پیدا ہوچکی ہیں، وہ امتحانوں میں کامیاب ہوچکا ہے لیکن اب آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے کہیں اسے یہ خیال نہ ہو کہ شروع سے اب تک میرا جبر کام کررہا ہے، میں نے اسے کوئی آزادی نہیں دی۔ تو سب کچھ

دینے کے بعد آپ نے کہا: میری خواہش تو یہ ہے کہ آپ ڈاکٹر بن جائیں مگر آپ میں صلاحیتیں سب ہیں اب انتخاب آپ پر چھوڑتا ہوں آپ جو چاہیں بن جائیں۔

آپ نے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور یہ چاہا کہ وہ ڈاکٹر بنے مگر یہ نہیں کہا کہ میرا حکم ہے ڈاکٹر بن جاؤ۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ خبردار دوسرے competition میں نہ بیٹھنا۔ اس لئے کہ جب بیٹھے گا نہیں تو پاس ہونے کا کیا سوال؟......... صرف میڈیکل کے competition میں آپ بیٹھیں گے۔ نہیں!........ بیٹا سارے competitions میں بیٹھئے مگر میری خواہش یہ ہے کہ میڈیکل میں جایئے۔ یعنی آپ جایئے، میری خواہش کا اگر خیال ہے تو آپ اپنے ارادے سے جایئے۔ آپ کام سیکھئے مگر اپنے ارادے سے سیکھئے۔

اس سے پہلے تک جب tutions کرتے تھے، tutor لگاتے تھے۔ تو بیٹے کے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ روزانہ صبح شام محاسبہ ہوتا تھا۔ فلاں ٹیچر آئے یا نہیں، ہوم ورک ہوا یا نہیں، امتحان میں پاس ہوئے یا نہیں؟....... پڑھا یا نہیں۔ کوئی ایک کلاس ناغہ نہ ہونے پائے۔ اب تک جبر تھا۔ اب جب نتیجہ حاصل ہونا ہے تو جبر کو ہٹا دیا، اختیار دے دیا۔

اسکول میں جبراً بھیجا، غذا جبراً کھلائی، سڑک پر سونے نہیں دیا، گھر میں جبراً لائے تم کیا لاوارث اولاد ہو؟ گھر میں رہو گے آٹھ بجے کے بعد باہر نہیں رہو گے۔ یہ جبر ہے لیکن تمام جبروں کے بعد اختیار دے دیا۔ خدا نے آپ کو زمین کے اوپر رکھا جبر ہے، آسمان کے سائے میں رکھا جبر ہے، جسم سے فائدہ اٹھانا ہے، جبر ہے، غذا تناول کرنی ہے جبر ہے۔ مگر اس کو سجدہ کرنا ہے تو اختیار دے دیا۔

لفظوں کو بدل دوں، نظام کو سمجھئے۔ روٹی نہیں کھاؤ گے تو مر جاؤ گے، خلاء میں چھلانگ لگاؤ گے ہلاک ہو جاؤ گے، جبر ہے۔ زمین پر قدم رکھنا پڑے گا، غذا لینی پڑے گی، سجدہ نہیں کرو گے تو موت نہیں آئے گی۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کرو مگر تم اپنے ارادے سے اس کی عبادت کرو۔

وہ چاہتا ہے کہ قربانی دو مگر اپنے ارادے سے قربانی دو۔ یہی فرقِ مراتب ہے ابراہیمؑ اور حسینؑ میں۔ (گفتگو ادھوری رہ گئی)۔ اگر اسماعیلؑ ذبح ہوجاتے تو جبرِ الٰہی کہلاتا۔ اگر اسماعیلؑ ذبح ہوجاتے تو جبرِ پروردگار ہوتا۔ ارے اٹھارہ اسماعیل کربلا میں ذبح ہوئے مگر حسینؑ کے اختیار سے ذبح ہوئے۔

کوئی جبر الٰہی نہیں ہے، حسینؑ کا اختیار ہے۔ پروردگار! تونے سب کچھ عطا کیا اب میں تیری راہ میں سب کچھ لٹارہا ہوں۔ پروردگار تو نے سب کچھ عطا کیا اپنے ارادے سے، اپنی مشیّت سے، اب میری قربانیاں قبول فرمالے۔ اس لئے ابراہیمؑ منیٰ تک گئے تھے۔ حسینؑ کربلا تک گئے۔

مقام ادب ہے، حدِادب ہے مگر کہوں گا اگر حسینؑ دینوی اعتبار سے عافیت کوش ہوتے تو منیٰ کا رخ کرتے۔ حسینؑ کو اپنی جانوں کے لئے فدیہ نہیں چاہئے اس لئے منیٰ نہیں جارہے ہیں کربلا جارہے ہیں۔ حسینؑ نے کربلا کا انتخاب کیا۔ جبر مشیّت نہیں ہے۔ عالم ذر کی تمثیلی روایتیں اسی لئے سنائی جاتی ہیں۔

خدا نے کہا: میری توحید بچانے کے لئے قربانی درکار ہوگی۔ سب نے سنا۔ انبیاء نے سنا، آدمؑ نے سنا، نوحؑ نے سنا، موسیٰؑ نے سنا، ابراہیمؑ نے سنا۔

حسینؑ نے آگے بڑھ کر کہا: میں دوں گا یہ قربانی۔

اختیارِ حسینؑ ہے، ارادہُ حسینؑ ہے، عزمِ حسینؑ ہے۔ اب اولوالعزم انبیاء ایک طرف، میرا اولوالعزم حسینؑ ایک طرف۔

آج اس عزا خانے کی روایت کے مطابق حسینؑ کی سب سے بڑی قربانی کا تذکرہ کرنا ہے۔ خدا آپ کی گودوں کو آباد رکھے۔ پروردگار کسی شیر خوار بچے کی ماں کو وہ منظر نہ دکھائے جو ربابؑ نے کربلا میں دیکھا۔ کیا کیا دیکھا۔ تفصیلات عرض نہیں کرسکتا۔ تفصیلات عرض کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سوچ لیجئے میں کیا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بحث کو مربوط کیجئے ذہن میں فضائل سے مصائب تک، عزم اور ارادہ کی بات ہو

رہی تھی، کل مکمل کروں گا اس بحث کو۔ اسی عزا خانے میں ۲۹ ذالحجہ کو جو بانیٔ عزا کے ایصال وثواب کے لئے میں نے مجلس پڑھی تھی اس کے آخری حصے میں ایک جملہ کہہ گیا تھا کہ موت جیسے جبرِ فطرت کے استعارے کو (جسے ہم نے جبر کا استعارہ بنایا ہے) قران نے اختیار کا انگیزہ بنادیا ہے۔ کہا تھا نا میں نے اور اسی لئے کہا ہے "فتمنوا الموت" موت کی تمنا کرو اور پھر تیزی سے یہ جملہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا کہ "تمنا کرو" کے معنی کیا ہیں؟ تمنا زبان سے نہیں ہوتی دل سے ہوتی ہے اور جب تمنا دل میں کامل ہوتی ہے تو پورے وجود سے ظاہر ہوتی ہے۔ ارادے کی بلند ترین منزل وہ ہے کہ یوں وجود سے ظاہر ہو۔ ارے آپ بڑوں کے ارادے کی کیا بات کرتے ہیں۔ حسینؑ نے جب خطاب کیا۔

هل من ناصرٍ ينصرنا ٥ هل من مغيثٍ يغيثنا ٥

ارے کوئی ہے جو ہماری مدد کو آئے۔ کوئی ہے جو ہماری فریادرسی کرے۔

بڑوں نے سنا، چھ ماہے نے جو غشی کے عالم میں تھا حسینؑ کی آواز سنی اور موت کی تمنا کی، خود کو جھولے سے گرا دیا۔ اصغرؑ کا جھولے سے گرا دینا موت کی تمنا کا اعلان ہے۔

حسین آئے، بچے کو لیا، میدان میں گئے، دامن عبا کو ہٹایا، دشمن سے پانی طلب کیا۔ اور شقی ابن شقی نے کہا:

اقطع كلام الحسين ٥ حسینؑ کے کلام کو قطع کردے۔

حُرملہ سے خطاب تھا۔ تیرِ سہ شعبہ چلا۔ حسینؑ کا کلام ایک دوسرے انداز میں آگے بڑھا۔ خطا نہ ہوا وہ چھ ماہا بچہ "فنقلب صبياً على يد الامام"

بچہ باپ کے ہاتھوں پہ منقلب ہوگیا۔

آخری جملہ کہہ رہا ہوں اور اس کے بعد ماتم کیجئے گا۔ ماتم حرام نہیں ہے۔ ماتم کرنا عزیزو! .... ماتم فطرت کا تقاضا ہے، زمین وآسمان ماتم کرتے ہیں، قران میں ماتم کا حکم ہے، رسولؐ نے ماتم کیا، رسولؐ نے ماتم کا حکم دیا، اس پر ماتم نہ کروگے تو کب کروگے؟

سنو حسینؑ نے ماتم نہیں کیا، ماتم تمہیں کرنا ہے۔ بچے کو لیا اور سات مرتبہ آگے بڑھے، سات مرتبہ پیچھے ہٹے۔ جملہ سنو۔ عزم و ارادے کی بات ! لوگ کہتے ہیں حسینؑ جیسے صابر کے پاؤں میں لغزش تھی ۔نہیں لغزش نہیں تھی۔ حسینؑ ناز فرما رہے تھے۔ چشم فلک دیکھ۔ حسینؑ کے قدموں میں کہیں لغزش ہے؟

یہ بار امانت حسینؑ لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ واحسینا، واعلیّا۔

مجلس ششم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادرانِ عزیز! وہ معاشرے کبھی تباہی سے دوچار نہیں ہوتے جو علِم اور علماء کی قدر جانتے ہیں۔ وہی مِلّتیں، وہی قومیں، وہی قوتیں، ذلیل و رسوا اور نابود ہوتی ہیں جو علِم اور علماء کی قدر کھو دیتی ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہمارا موضوع بھی عِلمیات کے مسائل سے مربوط ہے اور یہ ایک حقیقت ہے، کہہ بھی چکا ہوں اور اسے آپ کو درک بھی کرنا چاہئے آپ کو اس کا درک ہے ہی۔

الحمدللہ کہ انسانی زندگی گردش ہی کرتی ہے علمیاتی مسائل کے ساتھ۔ اگر انسان اپنی حقیقت و حیثیت سے آشنا ہے اور اس کو انسانیت سے محبت ہے، اگر انسان، انسان رہنا چاہتا ہے کہ وہ انسان بنا رہے تو اس کی زندگی کے محدود مسائل مادیاتی نہیں عِلمیاتی ہوتے ہیں۔ مادہ تو اس کی ٹھوکروں میں ہوتا ہے، مادہ تو پھر اس کے تصرف میں ہوتا ہے۔

جتنا انسان اولوالعزم ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی دنیا اُس کے سامنے بے بس ہوتی چلی جائے گی، حقیر اور بے بس ہوجائے گی۔ دنیا اپنے پورے لشکر کے ساتھ بالکل بے سرو ساماں اور بالکل ناتواں نظر آئے گی، ایک بشر بھی اگر صاحبِ عزم پیدا ہوجائے اور اگر کوئی امت صاحبِ عزم پیدا ہوجائے، اگر کوئی ملت صاحبِ عزم پیدا ہوجائے ....

علم و ارادے کی بحث یونہی تو نہیں چھیڑی ہے میں نے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ یہ بحث صرف علمی اور عقلی مسائل کی آسودگی کے لئے ہے۔ میں اکثر عملی زندگی سے بھی اشارے پیش کرتا رہتا ہوں کہ ہماری عملی روزمرہ کی زندگی، ہماری گھر کی زندگی، ہماری معاشرتی زندگی، ہماری دینی زندگی، ہماری اقتصادی زندگی، ہماری سیاسی زندگی۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ان مسائل سے خاص ربط پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مسائل مربوط نہیں ہیں۔

انسانی زندگی کی دو ضرورتیں ہیں۔ کچھ اسے نظریات چاہئیں، کچھ اسے نظامِ عمل چاہئے۔ نظریات کا نام اصول دین ہے۔ نظام عمل کا نام شریعت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اصول و قانون فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ مگر اکثریت اس کا ادراک نہیں رکھتی۔ اس آیت کو جو میں آپ کے سامنے تلاوت کررہا ہوں اس کا آخری فقرہ ہے:

ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۝

اکثر افراد اس کا علم نہیں رکھتے۔ یعنی اکثر افراد نہ دین کا علم رکھتے ہیں نہ اکثر افراد فطرت کا علم رکھتے ہیں۔ اگر فطرت کا علم ہو تو دین سمجھ میں آئے گا۔ اگر فطرت کا علم ہو تو تہذیبِ انسانی کے تقاضے سمجھ میں آئیں گے۔ اگر فطرت کا انسان آشنا ہوگا تو کبھی خوشی اور غم کے فطری اظہار کے آداب و رسوم پر بیجا اعتراض نہیں کرے گا۔

زندگی کی کچھ قدریں ہیں، زندگی کے کچھ ضابطے ہیں، زندگی کے کچھ اخلاقی اصول ہیں حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے بہاء الدینی کے عم محترم بہت زبردست عارف تھے اپنے وقت کے۔ چند برس پیشتر ان کا انتقال ہوا۔ اور ان کے بزرگوں میں ایک عظیم الشان عارف گزرے ہیں غالباً ان کے اساتذہ میں بھی رہے ہوں گے۔ عجب جملہ کہا انہوں نے

''فقہ مقدمۂ اخلاق ہے اور اخلاق مقدمۂ عرفان''۔ ابھی تک تو میں فطرت اور دین کی بات کر رہا ہوں کلی حیثیت سے، اجمالی حیثیت سے مگر تین چیزیں ہیں، کہ سب سے زیادہ لوگ لفظ حرام و حلال استعمال کرتے ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔ اور حلال چیزیں تو بہت کم سوجھتی ہیں اکثر چیزیں حرام ہی نظر آتی ہیں۔ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے، اپنا اپنا اجتہاد ہے۔ یہ بھی مجازاً کہہ رہا ہوں اس لئے کہ لفظ اجتہاد کے ساتھ خطائے اجتہادی کی ایک روایت ہے۔ آپ حضرات کا ادبی ذوق بھی مجھے کبھی کبھی ایسی باتیں کہنے پر اکساتا ہے۔ اجتہاد و خطا کے عنوان سے جتنی بحثیں ہوں، تاریخ وفقہ کے ابواب میں وہ اپنی جگہ مگر اردو کے غالبؔ نے دو عجب شعر کہے۔

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو

اب آپ کہیں گے ایک بار پڑھ دیا بس کافی ہے۔ ارے میری طبیعت کو جو لذت مل رہی ہے۔ اچھا شعر کہتے کسے ہیں؟ اگر اچھا شعر ایک بار پڑھ کر بھلا دیا جائے تو اسے اچھا شعر نہیں کہیں گے۔

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے گر ہم بُرا کہیں اس کو

آپ نے میری زبان سے منبر پر یزید یا یزید جیسوں کے نام زیادہ نہیں سنے ہوں گے۔ میں نام نہیں لیا کرتا ہوں منبر سے زیادہ۔ کبھی کبھی مجبوراً لے لیتا ہوں اور طبیعتِ انسانی کی نفاستوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جس کا نام نہیں لیا جاتا اس سے آداب بیزاری کے انداز بدل دیئے جاتے ہیں۔ عزاداری میں ماتم یہی ایک شرط ہے۔

کچھ شرافت انسانی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ملت اسلامیہ اپنے آداب و رسوم پر تو غور فرمائیے کہ پوری دنیا میں جب آج کے اقتصادی وغیرہ وغیرہ مسائل میں آپ احتجاجی جلوس لے کر نکلتے ہیں تو یہ بتایئے ان جلوسوں کا شرعی جواز کیا ہے؟

روزانہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جلوس نکالے جاتے ہیں اور جلوس کی قیادت کرنے کے مشتاق قائدین میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس جلوس کی قیادت میں میرا نام آئے، میری تصویر آئے اخبار میں نمایاں طور پر، کم از کم مجھے اس جلوس کا قائد مان لیا جائے۔ اور پھر ہر جلوس میں (عام بات کر رہا ہوں) مسلمانوں کے ہر جلوس میں خاص علامتیں ہوتی ہیں۔ اپنے جذبات کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لئے علامتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ کچھ کارڈ پر لکھ لیا، کچھ بینرز پر لکھ لیا، کچھ بازو پر پٹیاں باندھ لیں، کچھ پیشانی پر پٹیاں باندھ لیں۔ ایک ایک کے لئے بتایئے سیرت سے، شریعت سے، قران سے دلیلیں ملتی ہیں؟

کوئی مسئلہ ہو (عمومی گفتگو ہے) ہم اپنی زندگی کے مسائل کے لئے، دنیاوی زندگی کے مسائل کے لئے، جلوس، جلسے، تقریریں، علامتیں .... یہ علامتیں کیا ہیں؟ ....یعنی کہنے کی باتیں تو بہت ہیں مگر ہم سب کہہ نہیں سکتے تو یہ ایک دو علامتیں دیکھ کر سمجھ جاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

آج دنیا میں جو علامتیں بنائی جاتی ہیں وہ آج بنائی جاتی ہیں (جملہ سنیئے گا) خدا کی قسم یہ علامتِ علَم، یہ علَمِ اہلِ حجاز ہے جو ہم نے آج تک باقی رکھا ہے۔ آج کی ایجاد نہیں ہے۔ اس علَم کی یہ خاص ہیئت جو ہے، یہ خاص شکل، یہ shape، دنیا میں کہیں کسی حکومت کا علم ایسا نہیں ہوتا۔ کہیں دیکھا ہے ایسا flag کہیں ایسا پرچم دیکھا ہے؟ ارے کسی کو نصیب ہی نہیں ہے۔ نہ نصیب ہے نہ جرات ہے کہ اسے اپنالیں۔ اس علَم کو اپنانے کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اسے اٹھانے کی، اسے اختیار کرنے کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ وہ ذمہ داریاں ہر ملت اور قوم پورا کر نہیں سکتی۔ اس علَم کو اٹھانے کی سب

سے بڑی ذمہ داری ہے کہ کبھی کسی ظالم سے وفاداری کا رشتہ نہ ہو۔ دوسری یہ ہے کہ کسی مظلوم کی حق تلفی پر راضی نہ ہو اور یہ فطرت انسانی کے بلند تر تقاضے ہیں۔

گزارش یہ کر رہا تھا کہ انسان کو فطرت سے آشنا ہونا چاہیئے۔ اور فطرت سے آشنا وہی ہوگا جو صاحب علم وشعور ہوگا اور جو صاحب علم وشعور ہوگا وہ اولوالعزم ہوگا۔

اکثر لوگ شریعت کا کلمہ زبان پر جاری کرتے ہیں، دین کا حوالہ دیتے ہیں، فقہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ (بہت اچھا جملہ ہے یاد رکھیے گا۔ اس میں فقہ کی توہین نہیں ہے۔ آپ کو مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں فقہ کا استخفاف کروں گا، فقہ وشریعت کو ہلکا گردانوں گا؟ آپ کو مجھ سے توقع ہے؟ خدا مجھ کو نابود کردے جس لمحے میں اسی طرح کی کوئی بات سوچ بھی سکوں)۔

شریعت کی ایک اہمیت ہے، فقہ کی ایک اہمیت ہے لیکن زندگی کے مختلف مراتب میں، وجود کے مختلف مراتب میں اس کا مرتبہ تھا، اس کا رتبہ تھا...... کہاں سے کہاں تک یہ پہنچا دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فقہ مقدمۂ اخلاق ہے اور اخلاق مقدمہ عرفان اور عام ظاہر پرست فقیہ بیچارہ پہلے ہی مقدمے میں پھنسا رہ گیا، آخری مقدمے تک کیسے پہنچے گا۔

فقہ مقدمہ اخلاق، اخلاق مقدمہ عرفان۔ معنی کیا ہیں اس کے۔ جملہ عجیب ہے۔ ہمارے یہاں اخلاق کا بھی وہ تصور نہیں ہے جو حقیقی ہونا چاہیئے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ گھر میں کوئی آ گیا اور جب آ ہی گیا تو پھر اپنے گھر کی عزت وروایات وآداب کو برقرار رکھنے کے لئے، وہ جو بھی ہو ہمیں اپنے status کو بھی تو دیکھنا ہے .... نہیں! جو آیا ہے اس کے آنے کا احترام کرنا بھی ہے۔

آیا تو چائے پیش کردی اور سمجھے کہ حقِ اخلاق ادا ہوگیا .... سارا اخلاق ایک کپ چائے میں ادا ہوجاتا ہے۔ یہ اخلاق نہیں ہے۔ اخلاق تو وہ بادہ جاں فزا ہے جو کسی کوزہ میں سما نہیں سکتا سوائے ظرفِ قلبِ انسانی کے۔

یہ جو ظرف قلب انسانی ہے یہ ہے ظرفِ بادۂ اخلاق۔ انسانی نفس، انسانی قلب،

انسانی ذہن، انسانی وجود ظرفِ جان بشر۔ یہ ہے ظرفِ بادۂ اخلاق !

کہا گیا کہ فقہ مقدمہ اخلاق۔ کیونکہ یہ انسان سے ممکن تھا کہ تمام اخلاقی آداب و رسوم کو ترک کردے اس لئے پروردگار نے حرام و حلال کی شرطیں لگائیں، کہ یہ انسان کتنا ہی گرنا چاہے اگر کلمہ گو ہوگا تو میری خاطر کم از کم ایک حد پر آ کر رک جائے گا۔ یہ آخری حد ہے بلندیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ مثلاً انسان کی قیمت معلوم ہے؟......قرآن حکیم نے کیا کہا ہے کہ اگر کسی نے ایک بے قصور انسان کو قتل کردیا تو گویا اس نے کرۂ ارض کے تمام انسانوں کو قتل کردیا۔ یعنی ایک انسان اور تمام عالم انسانیت ! قرآن مجید کا جملہ ہے کسی جذباتی شاعر کا مصرعہ تھوڑی ہے۔

ایک بے قصور انسان (بے قصور ہونا شرط ہے) ایک بے خطا انسان اگر آپ نے قتل کردیا۔ تو گویا تمام عالم انسانیت کو قتل کردیا۔ اب سمجھے آپ کہ عزت و حرمت جان انسان کتنی ہے؟

دین سے ہٹ کے بھی سوچئے کہ ہمارے so called modern culture نے انسان کی قدر و قیمت کیا رکھی ہے اور انسان کو انسان بنانے والی عورت کی قدر و قیمت کیا رکھی ہے۔ صرف ایک اشتہار کا پرزہ، جلب منفعت کا ذریعہ !

خدا کی قسم ! ذہن انسانی کی گراوٹ کو تو دیکھیں۔ یہ روشن فکر اپنے دلوں کی تاریکی کا تو جائزہ لیں، دنیا میں کوئی شے بک ہی نہیں سکتی جب تک کسی چہرۂ نامحرم کا سہارا نہ لیں۔ ناموسِ انسانی کی یہی قدر و قیمت ہے؟

ایک انسان کی عزت، حرمت، جمال، جلال اس کی قدردانی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ کیونکہ معلوم تھا کہ انسان قدر ناشناس ہے اس لئے حد لگائی کہ بے خطا کسی انسان کا قتل کرنا حرام ہے؟

شریعت کیا کہہ رہی ہے؟ شریعت نے کوئی پیمانہ مقرر کیا کہ کسی انسان کی قدر کتنی کرو؟ کسی انسان کی عزت کتنی کرو۔ شریعت نے کوئی پیمانہ دیا ہے؟........ارے یہ پیمانہ

بن ہی نہیں سکتا۔ عزتِ انسانی اخلاقی مسئلہ ہے یا عرفانی مسئلہ ...... ایک عارف جانتا ہے کہ قدر و قیمتِ جانِ بشر کیا ہے۔ وہ انسان جس کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو اپنے رب کو پہچان لیا۔ اس انسان کی عزت کتنی ہوگی؟

اس کی قدر دانی کا کوئی معیار، کوئی پیمانہ، کوئی اصول، کوئی ضابطہ بن ہی نہیں سکتا۔ آخری حد بن سکتی ہے۔ اگر تم عزت نہیں کر سکتے، قدر دانی نہیں کر سکتے، آبرو کا خیال نہیں رکھ سکتے تو کم از کم اتنا خیال رکھنا، آخری حد تمہاری شقاوت کی یہ ہے کہ خبردار کسی بے قصور انسان کی کبھی جان نہ لے لینا۔

شریعت مقدمہ اخلاق....... اب آپ سمجھے کہ شریعت نے ایک حد مقرر کی کہ آپ جان نہیں لے سکتے۔ لیکن اب شریعت سے پوچھیں عزت کتنی کریں؟ کوئی حد نہیں ہے .... بس ایک حد ہے شرک نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ جو جس رتبہ کا ہو، تمہارا جیسا ظرف ہو، جتنی قدر دانی کر سکو کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسی لئے محمدؐ و آلِ محمدؐ نے کہا تھا: نَزِّلُونا عن الربوبية ہمیں ربوبیت سے نیچے رکھو۔

وادعوا عنّا حدود البشرية ہم سے بشریت کے تقاضے کو دور کر دو۔

پھر جو چاہو ہماری شان میں کہتے رہو۔

اس جملے کے معنی سمجھے کیا کہا کیوں کہا؟.......... رب نہ سمجھو ہمیں اور عام انسان بھی نہ سمجھو۔ پھر تمہارے حسب معرفت، جو جتنا سمجھا۔ اس نے ان کو ویسے ہی پکارا۔ جو جیسا ہوتا ہے ویسا ہی سمجھتا ہے۔ خطا کار ذہن یا پھر یہ کہوں خطا پسند ذہن۔ تجربہ ہر ایک کو ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خطا پسند لوگ بہت ہیں۔ خطا پسندی اب پیدا ہوگئی ہے یعنی ایک بات یہ ہوتی ہے کہ غلطی ہوگئی ہے، اپنی جگہ نادم ہیں، شرمندہ ہیں۔ اور ایک یہ کہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ غلطی تو ہوگئی لیکن اعتراف نہ ہونے پائے کہ غلطی ہوگئی۔ ایسی ایسی توجیہیں کرو کہ اپنی کمزوری دوسرے کے سامنے خوبی بنا کر بیان کرو۔ ارے! آپ اسے کمزوری سمجھتے ہیں۔ ارے! یہ تو میرے کردار کا حسن ہے۔ یہ میری خاص ادا ہے، یہ میرا مزاج ہے۔

آپ کو میرے مزاج کا اندازہ نہ ہوگا!

غلطی کو خوبی بنانا یہ خطا پسند ذہن کا طریقہ ہوتا ہے اور جیسے جیسے خطا پسند ذہن اقتدار پاتا ہے ویسے ویسے دین کو بھی پامال کرتا ہے فطرت کو بھی۔ ارے کبھی بھول کر کسی نے بسم اللہ نہیں کہی غلطی نہ مانے گا وہ قانون بنا دے گا کہ یہی صحیح ہے۔

میں ایک چھوٹی سی مثال دے دوں۔ فرض کیجئے میرا ایک اصول ہے۔ میں روزانہ منبر پہ آتا ہوں اور پہلے کہتا ہوں فاتحہ۔ اس کی حکمت بیان کر چکا ہوں۔ اب کبھی میں منبر پہ آیا اور بھول گیا نہیں کہا فاتحہ اعوذ باللہ سے تقریر شروع کر دی۔ جیسے ہی منبر سے اترا کسی نے کہا: آج آپ نے فاتحہ نہیں پڑھوائی۔ اب اگر شرافتِ نفس باقی ہے تو کہوں گا غلطی ہوگئی۔ آج غلطی ہوگئی آئندہ نہیں ہوگی۔

میں انسان ہوں معصوم نہیں ہوں۔ خطا کار انسان کی عظمت خطا پسندی میں نہیں ہے خطا کی درستگی میں ہے۔ غلطی کو درست کر لینا عظمت ہے۔ نہ کہ غلطی کو خوبی بنا کر دوسرے کو بھی فریب دینا اور اپنے نفس کو بھی۔ یہ عظمتِ نفسِ انسانی کے خلاف بات ہے۔ اگر خدانخواستہ میری طبیعت میں وہ عنصر نہ ہوا تو معلوم ہے کیا کہوں گا؟.......... اب میرا اجتہاد بدل گیا ہے نظریہ بدل گیا ہے۔ اب میرے سامنے وہ بنیاد آ گئی ہے کہ آج کے بعد وہ کبھی نہ کہوں گا۔ تاکہ وہ ایک دن جو بھول ہوئی تھی اسے کوئی بھول بھی نہ کہے۔ کہے یہ تو اصولی بات ہے۔ جب حکمراں کوئی غلطی کرتا ہے تو دین اور فطرت کے تمام تقاضوں کو بدلنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے افراد معاشرے میں بکھرے ہوئے ہیں، پھیلے ہوئے ہیں ہر طرف آپ دیکھئے گا کہ یہی کیفیت ہے۔

تو عرض کر رہا ہوں کہ خطا پسند نہیں ہونا چاہئے۔ خطا کاری ممکن ہے۔ خطا پسندی اچھی بات نہیں ہے۔ ہماری گفتگو ہو رہی ہے اس مسئلے پر کہ جب بھی دین و فطرت کے تقاضوں پر آپ غور فرمائیں گے، تو ان مسائل سے عملی زندگی میں دوچار ہونا پڑے گا۔ اور انسان اگر اس ربط کو سمجھے جو فقہ و اخلاق میں ہے، فقہ اور عرفان میں کیا ہے تو وہ بہت سے

مسائل کو سمجھے گا، بہت سی حدیثوں کو سمجھے گا، بہت سی روایتوں کو سمجھے گا کہ روایت گڑھی ہوئی ہے.......... گڑھی ہوئی وہ روایتیں ہیں جو خلافِ فطرت ہیں۔ اگر وہ انسان ہے تو غم میں آنسو نکلتے ہیں۔

اب اگر کسی حدیث میں یہ ہو کہ آنسو نہ نکلیں تو وہ حدیث گڑھی ہوئی سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ خلافِ فطرت ہے۔ لیکن جو حدیثیں فطرت کے مطابق ہیں وہ گڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ تو جب فضیلت کے مقام پر معصوم کہہ رہا ہے کہ ہم سے بشریت کے حدود کو دور رکھو اور ربوبیت کی منزل تک بھی نہ پہنچاؤ تو مبالغہ نہیں ہے یہ اسی پیمانے پر ہے کہ عام انسان کے نفس کی قدر و قیمت کتنی ہے۔

کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہوسکتا۔ آخری پیمانہ مقرر ہوا۔ عزتِ انسانی، آبروئے انسانی کہ آخر حد یہ ہے کہ اگر تم قدر دانی نہیں کرسکتے تو کم از کم قتل نہ کرو۔ جان کے درپے نہ ہو۔ اس سے تجاوز کیا تو حدود اللہ کے توڑنے کے مرتکب ہوگے۔

اچھا رُخ کو بدل دیجئے۔ جس طریقے سے عظمتِ انسانی کا کوئی پیمانہ نہیں ہے اصولی بات ہے ابھی تک یا جذباتی بات آپ کیا سمجھ رہے ہیں کوئی اصول ہے، کوئی بنیاد ہے اس گفتگو کی؟ ہے .... آپ کی فطرت میں ہے۔ آپ کے ذہن میں ہے آپ کی عقل، کُل عقل آپ کی گواہ ہے کہ جو گفتگو میں کر رہا ہوں یہ درست ہے۔

ایک انسان کی قدر و قیمت کا کوئی پیمانہ نہیں اور ایک انسان کو قتل کر دینے کی سنگینی اتنی ہے کہ قرآن نے کہا: گویا تمام افرادِ بشر کے قتل کے برابر۔

اب اگر کوئی انسانِ عظیم، اب اگر کوئی انسانِ معصوم، اب اگر کوئی انسانِ ہادی، اب اگر کوئی انسانِ مہدی، اب اگر کوئی ایسا انسان کہ جسے رفاقتِ پیغمبرؐ کا شرف بھی حاصل ہو اگر اس پر ظلم ہو اور اس ظلم کی بناء پر وہ دنیا سے اٹھ جائے تو اس کا غم منانے کا کوئی پیمانہ مقرر ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے اپنے ظرف و طبیعت کے مطابق ہے جتنا ظرف ہوگا اتنا غم بڑھتا چلا جائے گا۔

میرے سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں پہلے دن ملاقات ہوئی میں نے مصافحہ کرلیا۔ دوسرے دن اور جھک کے ملے میری تقریر پر خوب داد دی۔ میں سمجھا کہ میری بات سمجھ رہے ہیں ۔ اور وہ نکتے کہ جو میں سوچ رہا تھا کہ شائد مشکل ہوں گے وہ بھی سمجھ رہے ہیں اور داد دے رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر داد نہیں دے رہے ہیں کہ دوسرے بھی داد دے رہے ہیں بلکہ خود سمجھ کے داد دے رہے ہیں۔ آنکھیں بول رہی ہیں کہ سمجھ رہے ہیں۔

میری زبان بولتی ہے آپ کی آنکھیں بولتی ہیں۔ اور یہ اپنی اپنی سماعت ہے۔ آپ آواز سنتے ہیں میں نگاہ سنتا ہوں، میں نظر دیکھتا ہوں ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ سمجھ رہے ہیں۔ اب دوسرے دن جب مصافحہ کیا تو میں نے ذرا گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ جناب مصنف بھی ہیں، اب قدر بڑھ گئی۔ جیسے جیسے معرفت بڑھتی گئی دل میں عزت بڑھتی گئی لیکن بڑھے گی جب ، جب میں بھی دانش پسند ہوں گا۔ ورنہ جس دن یہ خیال آیا کہ یہ عالم ہیں ، یہ دانشور ہیں ، یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو میری جاہلانہ گفتگو پر گرفت کرنے لگیں تو انہیں دیکھ کر رخ موڑ لوں گا۔ علیؑ کے ساتھ تاریخ اسلام میں یہی ہوا۔

جرمِ علیؑ ..... علمِ علیؑ !۔

آپ دم بھرتے ہیں ، خواہ مخواہ مقدمہ لڑتے ہیں کہ ان لوگوں کی آپس میں بہت دوستیاں تھیں۔ لیکن فطرت گواہ ہے جاہل عالم کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔

تاریخ میں پہلا جرمِ علیؑ ..... علمِ علیؑ ..... کوئی جاہل کسی عالم کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔

تاریخ میں دوسرا جرمِ علیؑ ..... عدلِ علیؑ ..... کوئی ظالم کسی عادل کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرا جرمِ علیؑ ..... شفقتِ علیؑ ..... کوئی شقی کسی شفیق کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔

چوتھا جرمِ علیؑ ..... سخاوتِ علیؑ ..... کوئی غاصب کسی سخی کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔
تاریخیں پڑھیے، میرے مولا کے خلاف، آپ کے مولا کے خلاف، مسلمانوں کے مولا کے خلاف، انسانیت کے آقا کے خلاف، خدا کے خلیفہ کے خلاف، کھینچ لیجئے میرے منہ سے میری زبان ..... میں نے علیؑ کو خدا کا خلیفہ کہا۔ آدمؑ خلیفۃ اللہ ہیں..... علیؑ خلیفۃ اللہ نہیں ؟!

آدمؑ خلیفۃ اللہ تھے یا نہیں؟ ..... آدمؑ ابوالبشر خلیفۃ اللہ تھے ..... علیؑ خلیفۃ اللہ ہیں۔ کیوں ان سے بغاوتیں ہوئیں ؟ روزانہ بیت المال میں جھاڑو دیدینے والے علیؑ ..... ان کے وہ دوست کیسے ہوسکتے تھے جن کے سامنے کھڑے ہوکر کسی بزرگ صحابی کو قرآن مجید کی آیت سنانی پڑتی ہو کہ مالِ مسلمین تقسیم کردیجئے، خزانوں میں نہ رکھیے۔
گفتگو کہیں سے کہیں پہنچ گئی مگر یہ گفتگو ضروری ہے، ناگزیر ہے اس لئے کہ علیؑ کی امامت کا سلسلہ جاری ہے۔ کبھی کبھی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ بخشیں جاری کیوں ہیں؟ ارے جاری اس لئے ہیں کہ دنیاوی بادشاہوں کی بادشاہتوں کے دور ختم ہوجاتے ہیں روحانی اماموں کی امامتیں ختم نہیں ہوتیں۔ قیامت تک علیؑ کی امامت کا سلسلہ باقی ہے۔
یہ نکتہ سن لیجئے کبھی ہمارے یہاں بھی طالبعلموں کو اشتباہ ہوسکتا ہے۔ سمجھتے ہیں چالیس ہجری میں مولا کی شہادت ہوگئی تو گویا ان کا دورِ امامت ختم ہوگیا۔ ہمارے یہاں کتابوں میں بھی یوں ہی لکھا ہے۔ دیکھئے زبان کی مجبوریاں ہیں۔
۵۰ ھ میں امام حسنؑ کی شہادت ہوگئی تو گویا امام حسنؑ کی امامت کا زمانہ دس سال۔ چالیس سے پچاس، دس سال اور اس کے بعد امام کی امامت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور پھر ۵۰ ھ سے ۶۰ ھ کے آخر تک امام حسین علیہ السلام کا زمانہ اور اس کے بعد امام زین العابدینؑ کا زمانہ .... اسی طرح سمجھا ہے نا !.....
اماموں کی شہادت ہوگئی۔ امامتیں ختم نہیں ہوئیں !..... ہوسکتا ہے کچھ لوگ اسے علمی مسئلہ بنا دیں۔ علمی نہیں ہے..... تاریخ کی زبان الگ ہوتی ہے۔ عرفان کی زبان

الگ۔ تاریخ کا موضوع الگ ہے، عرفان کا موضوع الگ اور مجھے اس بات کو وہ جو میں نے ایک سائنٹسٹ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ کو فزکس خدا کے تصور تک پہنچاتی ہے۔ انہوں نے کہا: خدا فزکس کا موضوع نہیں ہے۔

تو جو بات میں عرض کر رہا ہوں یہ تاریخ کا موضوع نہیں ہے۔ تاریخ تو ظاہری زندگی کو دیکھتی ہے۔ تاریخ تو ولادت اور وفات کی تاریخ سے آگے بڑھتی ہے .....تو کسی کی ولادت اور وفات کی تاریخ سے دین میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اب تیزی کے ساتھ ایک جملہ کہہ کے آگے بڑھوں۔ کسی کی امامت یا کسی کی رہبری یا کسی کی نبوت یا کسی کی رسالت کے دور کے ختم ہو جانے کے کیا معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے بعد اس کے احکام منسوخ ؟

ایک عالم اور مجتہد تشریف فرما ہیں اور یہ بھی دبستانِ اجتہاد کا طالب علم ہے۔ عرض کر رہا ہوں کہ حضور جناب موسیٰؑ کی نبوّت کا زمانہ ختم ہو گیا، عیسیٰؑ کی نبوّت کا زمانہ ختم ہو گیا۔ حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ تھا اور ہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ختم تو نہ ہوا نا! ..... اِن کے آنے کے بعد اُن کی نبوّتیں اس لحاظ سے منسوخ ہو گئیں کہ اب ان کی شریعتوں پر عمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضورؐ ختمی مرتبت کی شریعت قیامت تک زندہ اور حضورؐ کے یہ بارہ کے بارہ وصی وہی ہیں کہ ان میں سے کسی کی بھی حدیث مل جائے، ان میں سے کسی کا بھی حکم مل جائے تو یہ نہیں کہنا ہوگا کہ ان کا زمانہ ختم ہو چکا.....

ان کا قول ملا اور حجّت تمام! ان کا قول آج بھی حجّت ہے،

علیؑ کا قول بھی حجّت، حسنؑ کا قول بھی حجّت،

حسینؑ کا قول بھی حجّت۔ سید الساجدینؑ کا قول بھی حجّت۔ بارہ اماموں میں سے ہر ایک کا قول حجّت ہے.....

جن کا قول بھی صحیح سند کے ساتھ مل جائے اور جب وہ کہہ دیں کہ شریعت یہ ہے ..... جب وہ کہہ دیں میرے نانا کی شریعت یہ ہے، خدا کے کلام کے معنی یہ ہیں تو وہ حجّت

ہے۔ کیوں ؟..... ان کے زمانے میں تفاوت تھا، ان کے ادوار میں تفاوت تھا مگر یہ سب کے سب امانت دارانِ ختم نبوّت تھے۔ اس لئے ان کی امانتیں ختم نہیں ہوئیں، سب آج بھی امام ہیں۔

علیؑ آج بھی امام ہیں۔ امام تھے نہیں! بس فرق یہی ہے کہ علیؑ کے مقابل پر جس کو بھی لائیں گے اس کے لئے ''تھے'' کہنا پڑے گا۔ علیؑ آج بھی ہیں اور رہیں گے۔

حسنؑ تھے نہیں امام ہیں۔ ان کا جسمِ پاک و پاکیزہ مدفون ہے، ان کی امامت زندہ ہے، ان کی امامت باقی ہے۔ مطالب کو میں نے آپ کے ذہنوں کے لئے چھوڑ دیا آپ خالی جگہوں کو پُر کر لیجئے۔

میں کہہ رہا تھا کہ امیر المومنین کی، اہلبیت کی عظمت و شان مبالغہ نہیں ہے یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ دو چیزوں کو مقابل میں رکھئے ایک انسان کی عظمت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوسکتا اور دوسری چیز انسان جب جدا ہو جائے تو اس کے غم کا پیمانہ کون مقرر کرے گا؟

شریعت بس ایک حد مقرر کرتی ہے کہ جب تک تمہارے کسی فعل سے تمہارے جسم و جان کو کوئی نقصان نہ پہنچے اس کے علاوہ جو بھی آدابِ غم ہیں وہ درست ہیں۔ اور اس درستگی میں ایک اور نکتہ فراموش نہ ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور مقصد حق ہو۔

سیاسی جلوس یہ اسلامی طرز ہے؟ لوگ جمع ہوئے سڑک پر چلنے لگے کچھ نعرے بلند ہوئے۔ لیکن اگر غلط مقصد کے لئے جلوس نکلا ہے تو غلط ہوگا اور جائز مقصد کے لئے جلوس نکلا ہے تو جائز ہوگا۔ غلط مقصد کے لئے جلسہ ہوا ہے تو غلط ہوگا، صحیح مقصد کے لئے ہوا ہے تو صحیح ہوگا۔ میں مثال دیدوں۔ اگر کوئی جلوس ایسا نکلے اور خدانخواستہ مسلمانوں کا گروہ نکالے کہ فرانس میں جو اسکارف پر پابندی عائد کردی گئی ہے وہ جائز ہے تو جلوس نکالنا حرام ہے اور اگر کوئی جلوس نکلے جس میں کہا جائے کہ فرانس میں جو پابندی لگائی گئی ہے وہ حرام ہے تو وہ جلوس نکالنا واجب۔

اگر باطل کی حمایت میں جلوس ہے تو حرام ..... حکومت فرانس کی تائید کیجئے کہ وہ اسلام کو پامال کر رہی ہے، حرام۔ اور ایسا جلوس لے کر نکلنے والوں کا ٹھکانہ جہنم۔ لیکن اگر آپ احتجاج کریں کہ فرانس کی حکومت نے جو قانون پاس کیا ہے وہ حقوقِ بشر کے بھی خلاف، حقوق انسانی کے خلاف، انسانی آزادی کے خلاف، اسلام کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف، جتنے مسلمان فرانس میں ہیں ان کی اسلامی اور مذہبی آزادی کے خلاف ہے اگر کوئی عورت اسکارف پہننا چاہتی ہے تو اسے پہننے کا حق دیا جائے تو یہ آپ کا جلوس حق ہوگا۔

تو ایک اصول مقرر ہوا کہ ظاہری رسوم بھی کوئی معنی نہیں رکھتے جب تک نیتوں کو نہ دیکھا جائے۔ نامِ حسینؑ لے کر سڑکوں پر آنے والے حق کا پیغام لے کر آتے ہیں، باطل کی مخالفت کے لئے آتے ہیں۔

آج دو موضوعات گفتگو میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ لیکن اب گفتگو کو تمام کروں۔ فطرت کو اور دین کو جب آپ سمجھیں گے اور علم اور ارادہ کو علمی اور نفسیاتی اور فلسفیانہ موشگافیوں کی روشنی میں لیکر جب آپ آگے بڑھیں گے اور اولوالعزم انسان ہوں گے تو ذہن تقلیدی نہیں ہوگا تحقیقی ہوگا۔ ہو ہی نہیں سکتا ذہن تقلیدی۔ درِ اجتہاد بند ہو ہی نہیں سکتا اور تحقیق کا انداز کہیں نہیں رکتا، آپ دیکھیں تو کربلا سے ہم کیوں جڑے رہتے ہیں۔

اللہ اکبر! ایسا معجزہ ہے کربلا۔ اُصول کی بات کرو۔ کتابیں نہ سمجھا سکیں گی کربلا سمجھا دے گی۔ فروع کی باتیں کرو۔ کتابیں نہ سمجھا پائیں گی کربلا سمجھا دے گی۔ اخلاق کی بات کرو، کتابوں سے سَیری نہیں ہوگی۔ کربلا میں آؤ سمجھ میں آجائے گا۔ عرفان کی بات ہو کربلا سمجھا دے گی۔ تحقیق جسے کہیں اس کی حد کیا ہے؟ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر اکبرؑ نے آگے بڑھ کے سمجھا دیا۔

جناب سید الشہدا جب منزلِ شرف سے آگے بڑھے تو ایک مرتبہ رہوار پر ہی

غنودگی سی طاری ہوگئی اور غنودگی جب دور ہوئی تو زبان پر تھا:

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ٥ بار بار کہا۔

جوان بیٹا آگے بڑھا: بابا! انا للّٰہ کہنے کا کیا سبب ہے؟

فرمایا: ابھی میں نے ایک آواز سنی کہ یہ قافلہ آگے بڑھ رہا ہے اور موت اس کے پیچھے پیچھے ہے۔

علی اکبرؑ نے کہا: بابا! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟

سوال بتا رہا ہے کہ بیٹے کو یقین ہے۔ سوال بتا رہا ہے کہ بیٹا معرفت رکھتا ہے۔ مگر پوچھ کر بتا دیا دنیا والوں کو کہ دیکھو یہ تحقیق کا مزاج ہے۔ اور صرف مزاجِ تحقیق نہیں ہے بلکہ اس میں ایک اعلان اور ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ کربلا کی جنگ میں رشتہ دار شریک ہوئے تھے۔ بیٹے نے ساتھ اس لئے دیا تھا کہ وہ باپ ہے یہ بیٹا۔ بھتیجے نے ساتھ اس لئے دیا تھا کہ وہ چچا ہے یہ بھتیجا۔ دوست نے دوست کا ساتھ دوستی کی بنا پر دیا تھا۔ نہیں ..... علی اکبرؑ نے بتایا بیٹے نے اس یقین کے ساتھ..... ساتھ دیا تھا، جان دی تھی، قربانی دی تھی کہ یہ حق پر ہیں، ہم حق پر ہیں۔

آقا نے فرمایا: ہم حق پر نہ ہوں گے تو کون ہوگا۔ بیشک ہم حق پر ہیں۔

اس کا جواز کیا تھا؟..... قران نے دو مقامات پر کہہ دیا کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔

آپ دیکھئے تو حق و صداقت کا کمال..... باپ نے کہا: ہم حق پر ہیں۔ تو بیٹے نے کہا: پھر موت کا کیا خوف! آپ مصائب سنا کیجئے۔ آنسوؤں کا اپنا کام ہے۔ ذہن کا اپنا کام ہے۔ آپ خود آنکھوں کو اشک افشانی سے نہیں روک سکتے۔ آپ ذہن کو سوچنے سے نہیں روک سکتے، ذہن کو تفکر سے نہیں روک سکتے۔ آپ سوچا بھی کریں اور آپ غم بھی منائیں۔

ہماری شان ہی یہ ہے کہ ہم بے سوچے سمجھے نہ خوشی مناتے ہیں نہ غم۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں فضائل بیان کروں گا۔ میں فضائل بھی نہیں بیان کروں

گا۔ آپ سوچتے ہوں گے میں مصائب بیان کروں گا۔ میں مصائب بھی بیان کرنے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ یہ اکبرؑ جو نام زبان پر آیا، جانتے ہیں یہ کون ہیں؟ صاحب کفایت الخطیب میں، علامہ سید محمد مہدی سوء جل الخفی نے، جو نجف اشرف کے اچھے معروف خطباء میں تھے، صاحب قلم تھے، بہت اچھے ادیب تھے، بہت اچھے شاعر تھے۔ اپنی ایک سے زیادہ کتابوں میں انہوں نے یہ واقعہ ایک سے زیادہ حوالوں سے لکھا ہے کہ مدینہ میں حضورؐ کی وفات کے ایک عرصہ گزرنے کے بعد کوئی شخص آیا، دور دراز سے اور مسجد نبوی میں پہنچا اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا: ای کم محمدؐ؟ تم میں محمد کون ہے۔

جو لوگ بیٹھے تھے وہ بے اختیار رونے لگے۔ اس نے کہا: رونے کا سبب کیا ہے؟

کہا: ہمارا حبیب، حبیب کبریا اس دنیا سے رحلت کرگیا۔ ان کی وفات ہوچکی ہے۔

کہا: ان کی کوئی تصویر ہے؟..... آنے والا مسلمان نہیں ہے اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ روتا ہوا ایک بوڑھا صحابی اٹھا اس کا ہاتھ پکڑا اور حسینؑ ابن علیؑ کے دروازے پر لے گیا۔

آقا نے دروازہ کھولا اس نے کہا: آپ نواسے ہیں میں معلوم کرنا چاہتا ہوں آپ کے نانا کی کوئی تصویر ہے؟ گھر میں بلایا، عزت سے بٹھایا، بیت الشریف میں تشریف لے گئے اور اس کے بعد اپنے بیٹے اکبرؑ کو بلایا، نانا کا عمامہ پہنایا، عبا پہنائی اور دونوں طرف تحت الحنک اور زلفیں اور بیٹے کو لے کر آئے۔

وہ شخص اہل کتاب میں سے تھا۔ شمائل نبوی، شمائلِ مصطفیؐ جو کتابوں میں اور صحیفوں میں انبیاءؑ کے لکھے ہوئے تھے اس نے نکالا، پڑھا۔ ایک مرتبہ پیشانی دیکھی، ابروؤں کو دیکھا، رخسار کو دیکھا، لبوں کو دیکھا، قد و قامت کو دیکھا کہا:

اشهد ان لا اله الا الله. اشهد ان محمد رسول الله۔

حسینؑ ابوعبداللہ مبارک ہو۔ ایسا بیٹا اللہ نے دیا۔

اس نے مبارک باد دی اور میرے آقا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس نے اجازت لی اور جانے لگا۔ کہا: ٹھیرو بیٹھو۔

اب ایک جملہ کہہ رہا ہوں۔ جس طرح حضورؐ کے شمائل صحف انبیاءؑ میں ہیں اسی طرح واقعۂ کربلا بھی مخصوص الفاظ کے ساتھ صحف انبیاء میں اور کتبِ سابقہ میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ آقا نے چاہا کہ اُس کا ایمان مکمل ہوجائے۔ اس کا دین مکمل ہوجائے۔ آقا نے کہا: یہ بتاؤ ایسا بیٹا تمہارے پاس ہوتا تو اس کی کتنی قدر کرتے، کیسے حفاظت کرتے؟.........

اس نے کہا: آقا! اس کی کوئی حد ہے، کوئی انتہا ہے۔ میں کس طرح حفاظت کرتا۔ (اب میں اپنی زبان میں اس کی ترجمانی کر رہا ہوں.....عربی میں جو کلمات کہے ہم اس کا ترجمہ کرنے میں قدرت نہیں رکھتے) جذبات اس نے بیان کئے کہا:

ہم سات پردوں میں رکھتے۔ ہر کسی کی نظرِ بد سے بچاتے۔

وہ تعریفیں کر رہا ہے وہ حفاظت کی تدبیریں بیان کر رہا ہے آقا بے اختیار گریہ فرما رہے ہیں۔ محاسنِ مبارک سے آنسو ٹپکنے لگے۔

کہا: گریہ کرنے کا سبب؟

کہا: تمہیں معلوم نہیں یہی بیٹا ہوگا اور میدان کربلا۔ میرا یہ بیٹا مجھ سے رخصت ہوجائے گا۔ میں خود اسے میدان کی طرف بھیجوں گا اور اس کے سینے پر دشمن کا نیزہ لگے گا۔ لاشے کو پامال کیا جائے گا۔ سرنوکِ نیزہ پر بلند ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

مجلس ہفتم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! سلسلۂ گفتگو آپ کے اذہان عالیہ میں محفوظ ہوگا۔ اس منبر سے مسلسل ہماری گفتگو فطرت شناسی اور دین شناسی ہے۔ اس سے متعلق آگے بڑھ رہے ہیں اور میں نے ایک بات عرض کی تھی کہ کوشش یہ ہے کہ ایک مکمل بات کہی جاسکے۔ کوئی ایک نکتہ واضح ہوسکے۔ فطرت کے گنبدِ بے در میں کوئی دریچہ کھل جائے۔ لاکھ گنبد بے در سہی ہم بھی تو اس حیدر کے ماننے والے ہیں جو پتھر کی دیوار میں بھی در کر دیتا تھا۔ فطرت شناسی غامد ہے، بہت دقیق ہے۔ لیکن یہ مدرسہ بھی تو کوئی ایسا ویسا مدرسہ نہیں۔

یہ بھی گزارش کی تھی کہ اسرارِ زندگی میں سے، اسرارِ فطرت میں سے، نکاتِ عرفان میں سے، اصول دین میں سے کوئی ایک اصل بھی اگر اچھی طرح اپنے تمام اطراف و جوانب کے ساتھ سمجھ میں آجائے تو پھر کوئی اور مسئلہ پیچیدہ نہیں رہ جاتا بلکہ مسائل کھلتے

چلے جاتے ہیں ۔ اور اس میں سب سے اہم اور یقیناً اُسی جوہر کو پہچان لینے سے متعلق ہے کہ جس جوہر کو علم کہتے ہیں کہ انسان کا شرف و امتیاز بھی اسی سے وابستہ ہے۔

انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہی اس لئے ہے کہ کسی اور حیوان میں علمی درک و دریافت کی صلاحیت نہیں پائی جاتی تو جس چیز سے انسانی شرف و امتیاز وابستہ ہو اس چیز کو بھی تو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور جب بات منحصر ہو جائے کہ بس یہی ہے سببِ شرف و امتیاز۔ چاہے وہ دینی اصطلاح میں ہو اور چاہے فطرت شناسی کی اصطلاحوں میں۔ آج کا سائنس دان بھی، آج کا ملحد بھی، آج کے دہریے بھی کم از کم اس بات کو مانتے ہیں کہ علم کوئی شے ہے اور اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ شے انہی کے پاس ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ انسان فریبِ نظر کا شکار ہو جاتا ہے۔ چیز اس کے پاس ہوتی نہیں مگر سمجھتا ہے کہ ہے۔ اسی بات کو کہتے ہیں جہل مرکب۔

اکثر یہ فقرہ میری زبان پر آجاتا ہے کہ دنیا میں ہم سب ماں کے پیٹ سے جاہل پیدا ہوئے لیکن جب ہمارا شعور پروان چڑھا تو ہمیں یہ شعور ضرور ہو گیا کہ ہم جاہل ہیں۔ اور جیسے ہی یہ شعور ہوا کہ ہم جاہل ہیں ویسے ہی طلب علم کی راہ باز ہوگئی۔ اگر احساس ہی نہ ہوتا کہ ہم جاہل ہیں تو طلبِ علم کا راستہ کیسے کھلتا؟

افسوس تو ان کی عقلوں پر ہے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ جاہل ہیں۔ ان کے علاج کے لئے مشکلات بہت ہیں، کم نہیں ہیں۔ بہرحال جاہل ہونے کے باوجود بھی ادعائے علم تو ہے۔ کہتے ہیں کہ علم کوئی شے ہے، علم ہمارے پاس ہے، اہل دین کے پاس علم نہیں ہے۔

اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو دنیا خود ہی دیکھ رہی کہ علم کہاں ہے کہاں نہیں ہے۔ علم کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اطرافِ علم میں جب ذہن انسانی سفر کرتا ہے تو پھر وہ ارادے کی حقیقت کو پہچانتا ہے اور میں نے گزارش کی کہ اگر انسان اپنے ارادے کے مراتب کو پہچان لے تو بہت سے اسرار کھل جائیں گے اور اسی زاویے

سے میں نے گزارش کی تھی کہ پورا نظامِ فکر حاصل ہوسکتا ہے اس زاویے سے کہ اپنے ارادے کو پہچانیں، اپنے ارادے کے مراتب کو پہچانیں اس کے بعد خدا کے ارادے بھی سمجھ میں آجائیں گے۔ مکمل طور پر نہ سہی تقریبِ ذہن تو حاصل ہوجائے گی اور خدا کے نمائندوں کے ارادوں کی جو قوت ہے وہ بھی سمجھ میں آجائے گی۔

عزم انبیاء بھی سمجھ میں آجائے گا۔

عزم ائمہ بھی سمجھ میں آجائے گا۔

عزم حسینؑ بھی سمجھ میں آجائے گا۔

سب کچھ سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ تقریب ذہن ہوتی چلی جائے گی اگر اپنے ارادے کی ماہیت اور ارادے کے مراتب کو پہچان لیں۔ اور یہاں تک کہ جبرو اختیار کا الجھا ہوا مسئلہ اور خیر وشَر کا انتہائی پیچیدہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔

شَر کا کوئی وجودِ حقیقی اس کائنات میں نہیں ہے۔ شَر کے تصور سے طبیعتیں ہراساں نہ ہوں، طبیعتیں بے ہمت نہ ہوجائیں۔ آپ حوصلے ہار نہ جائیں، حوصلے بلند رکھیں۔ شر کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، خالقِ کائنات خیرِ مطلق ہے۔ جو اس نے پیدا کیا وہ خیرِ محض ہے۔

خدا خیرِ مطلق ہے اس میں تو کسی کو شک وشبہ نہیں ہے۔ ہر چیز جو قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی وہ خیر بداماں ہے۔ اس میں شَر وجود نہیں رکھتا اسی لئے فلسفہ میں یہ بات بڑی وضاحت سے کہی گئی کہ شَر تو ایک امرِ انقضاعی ہے، انقضاعی کے کیا معنی ہیں کہ خالق نے جو اشیاء پیدا کی ہی ان میں شَر نہیں پایا جاتا بلکہ انسان جب ان چیزوں کو برتتا ہے تو اپنے علم کی کمی کی بناء پر، اپنے ارادے کے ضعف کی بناء پر، اپنے فیصلوں کی غلطی کی بناء پر شَر میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ خنجر کا وجود شَر نہیں ہے ارادۂ قاتل میں شَر پنہاں ہے۔ حدید کو نازل کیا گیا۔ خنجر کا وجود شَر نہیں ہے، انسان کا ارادہ ہے جو خنجر کا غلط استعمال کرتا ہے۔

کاٹنی چاہیئے شہ رگِ کفر، کاٹ دیتا ہے گلوئے ایمان۔

اب سمجھ میں آئی بات۔ کائنات میں جبر بھی اس اعتبار سے نہیں ہے کہ انسان غلطی

کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ دونوں فلسفے بہت دقیق ہیں، بہت دشوار ہیں، بہت مشکل نظر آتے ہیں۔ ایک جبر و قدر کا مسئلہ، ایک خیر و شر کا۔

ہم نے مشرق کے فلسفیوں کی کتابیں پڑھیں، مغرب کے فلسفیوں کی کتابیں پڑھیں۔ اکثر کی طبع حال یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں: قلم اینجا رسید و سر بشکست۔ جب اس مفہوم تک قلم پہنچا تو اس نے اپنا سر توڑ لیا، پھوڑ لیا۔ لیکن اس مفہوم کو ادا نہ کر سکا۔

ایسا نہیں ہے۔ بہت آسان ہے اس مسئلہ سے گزر جانا البتہ ہر جگہ پائے دلیل بہت زیادہ فصاحتوں کو درک نہیں کر پاتا۔ اس لئے ایمانی وجدان بھی ضروری ہے۔ فطری حقائق کو وِجداناً حاصل کرنا چاہیئے۔ یعنی چشم دل ایسی باز ہو جائے کہ حقائق کو دیکھ لے اور انسان حقائق کو اپنی ذات میں سمو لے۔ خاص طور پر میں آپ کو حوالہ دے دوں کہ خیر و شر اور جبر و قدر کا مسئلہ آتا ہے کہ جسے بعض ایسے شاعروں نے حل کر دیا کہ جنہیں آپ کہیں گے کہ وہ اچھے شاعر نہیں تھے۔ بہت سے مفکر شاعروں نے مسئلہ کو الجھایا کہ جس سے آپ کسی صورت سے آسودگی ہی نہیں حاصل کر سکتے اور ایک زبان کا شاعر ..... اس نے مسئلہ کو دو مصرعوں میں حل کر دیا۔ مجھے حیرت ہوئی اس لئے میں نے جستجو کی تو معلوم ہوا سبب یہ تھا کہ رشتۂ ایمانی مستحکم تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ۔ سب نے نام سنا ہوگا ہمارے جدید اردو کے ناقدین، ناسخ کا نام سنتے ہی ان کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ ہم نے بہت سے لوگوں کے چینِ جبیں کو دیکھا ہے لیکن دیکھ کر مجھے کوئی بے چینی نہیں ہوئی اس لئے کہ مجھے ناسخ کے ایمان و عرفان کا ادراک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ناسخ کیسا باکمال شاعر ہے۔

وہ مفکر، فلسفی عام اصطلاح میں نہ تھے لیکن ناسخ کے کلیات میں، جہاں زبان کے اشعار ملیں گے، جہاں رعایتِ لفظی ملے گی وہاں بہت سے ایمانی جوہر کے حامل اشعار مل جائیں گے۔ منجملہ ان کے آپ دیکھئے دو مصرعے ہیں اور اس میں جبر و قدر کا فلسفہ ایسا حل کیا ہے کہ بہرحال میری طبیعت اس شعر کے معنی سے بہت محظوظ ہوتی ہے۔ اس میں اختیار

کا لفظ بھی ہے، بلا کا لفظ بھی ہے۔ عدم بھی ہے وجود بھی ہے۔

یعنی عجیب وغریب شعر ہے جتنی اصطلاحات ہیں وہ بھی جمع ہیں اور لفظِ بلا ایسا بلا کا رکھ دیا ہے کہ بس !..... اردو میں بلا کے کیا معنی ہیں؟ ..... مصیبت، عربی میں بلاء ..... ابتلا یعنی آزمائش۔ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واقعے میں قرآن نے جو استعمال کیا وہ ہے بلاءٌ مبین استعمال ہوا یعنی کھلا ہوا امتحان۔ روشن امتحان، سامنے کی بات، آزمائش اب وہ کہتے ہیں۔

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

یعنی انسان کو اختیار دیا بھی اس لئے ہے کہ امتحانوں سے گزرے۔ میدان امتحان سے فرار اختیار نہ کرے۔ امتحان و آزمائش سے گریز نہ کرے۔ ہمیشہ یہ نہ سوچے کہ زندگی راحتوں میں گزرے، زندگی استراحتوں میں گزرے۔

راحت و استراحت بشر جیسے اولوالعزم مخلوق کو زیب نہیں دیتی۔ سفر مسلسل جاری رہے۔ فکری مشکلات کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اعتقادی مسائل کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ عملی مشکلات کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اور صرف اپنی ہی مشکلات کو حل کرنے کی فکر میں نہ رہیں بلکہ کائنات کی مشکلات کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

آپ اشرفِ مخلوقات ہیں اور اشرف کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے بدون ورتبہ مخلوقات کا خیال رکھے، ان کی مشکلات کو حل کرے۔ جو اس راز کو پا گیا وہی تو کائنات میں مشکل کشاء بنا۔ جو اس راز کو نہ پاسکا وہ مشکلات میں گھر کر ہلاک ہوا۔ جو صرف اپنی مشکلات کے بارے میں سوچتا رہا وہ اپنی ہلاکت کے اندیشے میں ہمیشہ مبتلا رہا اور جس نے اپنی مشکل کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ وقف کردی اپنی زندگی دوسروں کی مشکلات کو حل کرنے میں وہ اپنے پرائے سب سے قصیدے سنتا رہا، لولا علی'' اگر علیؑ نے نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔

جو اختیار دیا گیا ہے آپ کو وہ اس لئے دیا گیا ہے کہ آپ آزمائش سے گزریں۔

اور اگر آپ کے پاس مشکلات نہ ہوں، آپ کے پاس اقتدار ہو، آپ کے پاس قوت ہو، آپ کے پاس صلاحیت ہو، آپ کے پاس استعداد ہو، آپ مشکل کشائی کر سکیں تو دوسروں کی مشکل کشائی کریں، دوسروں کی مشکلات کو حل کریں۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

پروردگار کی عبادت کے لئے، سجدہ گزاری کے لئے، رکوع کے لئے، قیام کے لیے، تسبیح کے لئے، تہلیل کے لئے، تمجید کے لئے، تحمید کے لئے، ملائکہ کی کمی نہ تھی نہ ہے۔ آپ کو اس لئے پیدا کیا گیا کہ آپ اختیار لے کر آئیں اور اپنے اختیار سے، اپنے ارادے سے اس زمین کو بہشت بنائیں۔

کئی دن ہو گئے مجلس کے بعد ایک جوان نے مجھ سے آ کر پوچھا کہ آدم علیہ السلام کو جنّت سے کیوں نکالا گیا؟ (میرا جواب ہے) آدمؑ کو جنّت میں رہنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ پیدائش سے پہلے اعلان کر دیا گیا تھا۔ فرشتوں کو بتا دیا گیا تھا کہ ہم زمین کے لئے اپنا خلیفہ بنانے والے ہیں۔ اُس آیت کو کیوں بھول جاتے ہیں اس فقرہٗ قرانی کو میرے اس بیان سے مربوط کر لیجئے کہ انسان راحت و استراحت کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ انسان بنی بنائی جنّت میں رہنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ اس ویرانے کو بہشت بنانے کے لئے پیدا کیا گیا۔ اس خاکنائے دہر کو اس خاک زار کو بہشت بناؤ....... اور وہ تمہارے ارادے سے بنے گی، تمہارے علم سے بنے گی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی

کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہ شعر سنتے رہتے ہیں۔ سر دھنتے رہتے ہیں شاعر کو داد دیتے رہتے ہیں۔ مگر سوچئے تو سہی یہ آپ کے ارادے کی بحث تو ہے کہ عمل سے جنّت کو تخلیق کیا جاتا ہے۔ عمل سے جنّت تخلیق ہوتی ہے۔

اس حدیث پر آپ غور فرمائیں: ایک انسان، ایک مومن جب اپنی زبان پر یہ

تسبیحیں جاری کرتا ہے: سبحان اللّٰہ والحمدللّٰہِ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ٥

جیسے جیسے وہ یہ تسبیحیں پڑھتا ہے ویسے ویسے اس کے لئے بہشت میں قلعہ تعمیر ہوتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں کہ آپ عمل انجام دے رہے ہیں! بہشت تعمیر ہو رہی ہے۔

آپ یہ نہیں چاہتے کہ اپنی تعمیر کی ہوئی بہشت میں جائیں؟ آپ چاہتے ہیں کہ کوئی بنادے بہشت تو آپ کو مل جائے؟ بہشت کوئی بنادے اور آپ کو آگاہ کر دے؟ جی نہیں۔ آپ کو اختیار عطا کیا گیا۔

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اُٹھی تقدیر

تقدیر کا لفظ بھی کیا استعمال کیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس جو لکھا جاچکا حتمی ہے۔ مقدر بن گیا۔ شقی اب شقی ہی رہے گا، سعید اب سعید ہی رہے گا۔ جس کو کامیابی لکھ دی گئی وہ کامیاب ہی رہے گا۔ جس کی قسمت میں ناکامی لکھ دی گئی وہ ناکامیاب رہے گا۔ جسے مفلس لکھ دیا گیا وہ مفلس رہے گا۔ جسے غنی لکھ دیا گیا وہ غنی رہے گا۔ نہیں !.......تقدیر کے معنی یہ ہیں کہ استعدادات اور صلاحیتیں اور امکانات پوشیدہ کر دیئے گئے ہیں۔ تمہارے ارادے سے تمہاری تقدیریں بدل سکتی ہیں۔

اب ایک اور شاعرِ اہلبیت کے چار مصرعے یاد آرہے ہیں مجھے۔ اور وہ بھی جبر واختیار سے متعلق ہیں۔ عجیب انداز میں رباعی کی مخصوص بحر میں، رباعی سب سے مشکل صنف ہے۔ اس کے اوزان، بحور، ارکان، تقاضے، اس کی ہیئت، اس کا ظرف تو بہت محدود ہے، اس کی کیفیت آفاقی ہے۔ اسی لئے اکثر رباعی میں حکیمانہ مضمون سمو دیئے گئے۔ یہ بھی حکیمانہ مضمون دیکھئے۔

ہر چند کہ جبر خشتِ بنیادی ہے
فطرت نے مگر راہ بھی دکھلادی ہے
اُٹھے تو دو عالم کو مسخر کر لے
اتنی حدِ زنجیر میں آزادی ہے

عزیزانِ محترم! آپ کو اختیار دیا گیا۔ مقدرات بنائے گئے۔ یعنی امکانات کو زمینِ وجود میں بکھیر دیا گیا۔ امکانات کی تخم ریزی کی گئی اور یہ سب آپ کے ارادے پر چھوڑ دیا گیا۔ اب ایک بڑا مسئلہ جبر و اختیار کے ساتھ ساتھ خیر و شر کے باب میں آتا ہے کہ پروردگار نے شیطان کو خلق ہی کیوں فرمایا؟ آدمؑ کے متعلق سوال تھا نا! اور آدمؑ کے بعد دوسرا سوال شیطان کے بارے میں ہوتا ہے۔ شیطان کو خلق ہی کیوں فرمایا؟

اب یہ بحث بہت تفصیلی ہے۔ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے علمی اصطلاحوں میں لیکن پھر دہراؤں گا کہ خیر مطلق نے جو کچھ خلق کیا ہے وہ خیر محض ہے۔ وجودی اعتبار سے شیطان بھی خیر محض ہے اور اس کو اختیار جو دیا آپ کے اوپر تو کس قسم کا اختیار ہے۔ کبھی غور کیا آپ نے..... آپ کا ہاتھ پکڑنے کا اختیار ہے شیطان کو؟

آج تک مجھے کوئی نہیں ملا جو کہے کہ میں مسجد کی طرف جا رہا تھا، نہ جانے کوئی ایک ہاتھ آیا مجھے پیکر تو دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر ہاتھ ایسا تھا جیسے لوہے کا ہاتھ، کانٹے میرے ہاتھ میں چبھ رہے تھے اور وہ کشاں کشاں مجھے مسجد کی راہ سے میکدہ لے گیا..... نہیں کوئی نہیں..... شیطان ہاتھ پکڑ کے کہیں نہیں لے جاتا۔ شیطان کو کل تصرف یہ دیا گیا کہ وسوسہ کرسکتا ہے۔ اپنی اشرفیت کو پہچانو۔ شیطان کا وسوسہ قوی ہے یا تمہارا ارادہ؟

جسے دیکھیے۔ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟..... شیطان وسوسہ ڈالتا ہے!.....

کسی نے کہا کہ شیطان نے سجدہ گاہ غائب کردی؟

شیطان نے جاء نماز اُٹھا کر رکھ دی؟

شیطان وضو کے پانی میں غوطے کھانے لگا؟

روزے کیوں نہیں رکھتے؟..... شیطان کا وسوسہ۔

حج پر کیوں نہیں جاتے؟ شیطان کا وسوسہ۔

ماتم کیوں نہیں کرتے؟..... شیطان کا وسوسہ۔

نہ کسی نمازی کا ہاتھ شیطان نے پکڑا اور نہ کسی ماتم کرنے والے کا ہاتھ..... یہ ہمارا

ارادہ ہے کہ ہم حق کی راہ میں ماتم کرتے ہیں۔ ارادہ قوی ہے شیطان کا وسوسہ قوی نہیں۔

خیر وشر کے باب میں آج کے بعد شیطان کا نام نہ لیں۔ کیا اختیار دے دیا ہے اللہ تعالیٰ نے شیطان کو؟ کچھ نہیں۔ طول حیات دے کر اسے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اس لئے کہ بار بار مومنین سے ٹکرا کر دیکھتا ہوگا کہ میرا وسوسہ کوئی کام ہی نہیں کر رہا۔

کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے شیطان...... ایک مخلوق ہے جو اللہ نے پیدا کی۔ جیسے ہم کو اختیار دیا گیا شیطان کو بھی دیا گیا۔ ہم کو اختیار دیا گیا تو اچھی بات تھی شیطان کو اختیار دیا گیا تو اچھی بات نہیں تھی؟

کیا اعتراض ہے خدا پر؟..... خدا کی قسم۔ جب معلوم تھا کہ شیطان ایسا ہوگا، ویسا ہوگا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا؟..... میں پوچھوں خدا کو معلوم تھا کہ آپ اس پر اعتراض کریں گے تو آپ کو پیدا ہی کیوں کیا؟

آپ اس کے خلاف لب کشائی کر رہے ہیں!..... بھئی یہ اس کا لطف ہے کہ ہمیں اختیار دیا۔ آپ پر لطف ہوا تو ٹھیک۔ شیطان پر لطف ہوا تو غلط۔

یہ اس کی شان ہے کہ سب پر لطف کرے۔ اب دیکھے گا کہ کون میرے کرم کی قدر دانی کرتا ہے، کون نہیں کرتا۔

شیطان کے ارادے ہیں نچلا تو نہیں بیٹھا اب آپ نکالئے اسے اپنے پاس سے لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب وہ یہاں آتا ہی نہیں تو نکلنے کا کیا سوال؟

اور یہ جملہ ایسے ہی نہیں کہہ دیا، خطابت کا ایک انداز نہیں ہے۔ ابراہیمؑ کی تاریخ میں ملے گا قدم قدم پر شیطان آیا۔ ہاجرہؓ کے سامنے آیا، اسماعیلؑ کے سامنے آیا، ابراہیمؑ کے سامنے آیا۔ کربلا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو..... کہیں آیا؟ ......

ابھی فضائل پڑھ رہا ہوں۔ ارے ہاجرہؓ کے پاس آیا، امِ فروہؓ کے پاس کیوں نہ آیا؟ ہاجرہؓ کے پاس آیا، لیلیٰؓ کے پاس کیوں نہ آیا، ہاجرہؓ کے پاس آیا زینبؑ کے پاس کیوں نہ آیا۔ اس لئے کہ ارادہ قوی ہوگا..... یہ حسینؑ کے جد کا کنبہ ہے۔

دیکھا کیسا ذلیل ہوا ہے شیطان ، کیسا رسوا ہوا ہے شیطان۔ کیا دیا ہے اختیار شیطان کو؟ پوری تاریخ کربلا میں شیطان کا گزر نہیں ہے۔

کون مسلمان ہے جو کربلا سے وابستہ نہیں ہے..... حسب مراتب، حسب معرفت، حسب ظرف ۔جس کا جتنا ظرف ہے۔جس کی جتنی معرفت ہے اس کو اتنا تعلق ہے حسینؑ سے ۔جس میں جتنی جہالت ہے اتنا ہی دور ہے حسینؑ سے۔

خیر و شر کے باب میں سب سے بڑا شبہ شیطان ہی ہے اور سب چھوٹے چھوٹے شبے ہیں ۔تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بنیادی مسئلہ ختم ہوگیا۔ ایک طرف ہے وسوسہ ایک طرف ہے ارادہ ۔

اور ایک انسان کا ارادہ، قوی ارادہ، علمی ارادہ، عرفانی ارادہ، ایمانی ارادہ اتنا کام کرتا ہے۔ اگر اسے دیکھنا ہوتو اپنے چاروں طرف نظر دوڑایئے ستاروں کے اوپر ستاروں کے احکام، نجوم کے احکام، جوتش کے احکام کیا ہیں؟ اسے کہاں تک مانیں؟ سنیں گے؟ .....ارادۂ انسانِ کامل کیا ہوتا ہے؟.....

علیؑ گھر سے نکل رہے ہیں جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔

علم جوتش کا ماہر سامنے آتا ہے۔کہتا ہے: اس وقت جنگ کے لئے نہ جائیں.......

کہا: کیوں؟.....

کہا: ستارے اس طرف ہیں کہ شکست ہوگی۔

کہا: ستارے قوی ہیں یا میرا ارادہ؟ گئے اور فتح یاب آئے۔

آپ نے دیکھا کہ ارادہ ستاروں کو محکوم بناتا ہے ۔ زمین کیا چیز ہے ارے مصطفےؐ کا ارادہ تھا اشارہ کیا چاند دو ٹکڑے ہوگیا۔

رحمِ مادر میں علیؑ ، جدار کعبہ شق ہوگئی۔ یا علیؑ کا ارادہ یا فاطمہ بنت اسدؑ کا ارادہ۔ یا لطفِ خدا۔ لطف خدا تو ہے ہی۔ ارادہ خود لطفِ الٰہی ہے۔

فوراً اعتراض کہ اتنے بڑے معجزے کو ایک فرد کے ارادے پر رکھ دیا۔ معجزہ کہاں

رکھا۔ کارِ خدا کہاں گیا؟ کارِ خدا کے ہاتھ میں ارادہ دے دیا۔ اس بندہ کی بندگی کا کمال یہ تھا کہ اس کے عمل کی ایسی قدر دانی کی کہ ارادہ اتنا قوی ہوا کہ کارِ خدا بھی انجام دینے لگا۔

ولادت مولا کے سلسلے میں چار افراد کے نام لئے جاسکتے ہیں پانچویں کا نہیں۔ کیسے ہوگی، کب ہوگی، کہاں ہوگی، گھر میں ہوگی، ہسپتال میں ہوگی، دایہ کون ہوگی۔ ڈاکٹر کون ہوگا۔ انتظامات کیا ہوں گے۔ فکر کسے ہوگی؟ باپ کو، ماں کو یا قریب ترین فرد کو۔

باپ کا نام ابوطالبؑ، ماں فاطمہ بنت اسدؓ، قریب ترین اور اہم ترین فرد مصطفیٰؐ۔ یا ارادۂ مصطفیٰؐ تھا یا ارادۂ بنتِ اسدؓ یا پھر ارادۂ ابوطالبؑ۔

ارادہ ستاروں کو محکوم بناتا ہے۔ انسان کامل کا ارادہ ذروں کو زبان عطا کرتا ہے۔ ہمیں اور آپ کو ارادوں کی پختگی کے لئے اور آزمائش سے گزرنے کے لئے کربلا کی طرف دیکھنا چاہئے جہاں شیطان کا گزر بھی نہ ہوا۔ ہاں! چھوٹی چھوٹی باتیں ملتی ہیں۔

میں عرض کروں۔ تاریخ میں موجود ہے اور یہ وہ باب ہے جو شائد ہمارے شعراء کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا ان کے سامنے کوئی ایسا انگیزہ پیدا نہ ہوا جس کی بناء پر وہ ایک رزمیہ تخلیق کرتے۔ کتنے رزمیے اب تک لکھے گئے ہیں کربلا کے حوالے سے وہ خارجی رزمیے ہیں۔ گھوڑا کیسے چلا، تلوار کیسے چلی، غبار کیسے اٹھا، دشمن قتل کیسے ہوا۔ جنگ کیسے ہوئی، خون ریزی کیسے ہوئی۔ یہ خارج کے رزمیے ہیں۔ داخل میں جو رزمیہ ہوتا ہے حیاتی رزمیہ خیر وشر کے درمیان، اس کا ذکر بھی کربلا میں ہے۔ ایسا نہیں کہ نہیں ہے۔ میں ایک ادبی تعبیر عرض کر رہا ہوں۔

حسینؑ خیرِ مطلق کے خیرِ محض نمائندے ہیں۔ حسینؑ تو امامِ معصوم ہیں۔ حسینؑ! حسینؑ ہیں۔ حسینؑ تو اولوالعزم ہیں جو قائماً بالقسط ہیں۔ اگر داخل کا رزمیہ دیکھنا ہو۔ میں عرض کیا کرتا ہوں۔ کربلا کی تاریخ میں عام افرادِ بشر کے لئے، عام انسان کے لئے، عام مسلمان کے سب سے بڑی قابلِ توجہ شخصیت حُرؒ کی ہے۔

حُرؒ وہ وجود ہے جہاں شیطانی وسوسے ہی نہیں بلکہ شیطانی ہاتھ بھی اس کو پکڑ رہے

تھے۔ شیطانی نظام میں جکڑا ہوا تھا (کل خطا پسندوں کی بات کی تھی آج حق پسندوں کی بات کر رہا ہوں)۔

وہ تو شیطانی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ تنخواہ دار ملازم تھا، عہدہ دار تھا۔ اس کے اوپر کتنا دباؤ تھا، عبید اللہ ابن زیاد کے لشکر کا ایک سردار تھا۔ اور اسے بھیجا گیا امامؑ کو گرفتار کرنے کے لئے۔ تاریخ میں ہے نا! تو کس چیز نے حُر کو حُرؑ بنایا؟ ....

خیر وشر پر بحث کرنے والے، اپنی زندگی کی مجبوریوں کا رونا رونے والے۔ کیا کریں ہماری تجارت ہے، کیا کریں ہماری ملازمت ہے؟..... ارے مولانا! آپ تو خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں، آپ تو حجرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میدانِ زندگی میں تو ہم نکلتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کتنی دشواریاں ہیں، کن کن سے معاملہ ہوتا ہے.....

تمہارا معاملہ حُرؑ کے معاملہ سے زیادہ سنگین ہے؟..... کون چاہتا ہے کہ اپنے نظام سے بغاوت کرے اور مارا جائے ..... حکومتوں میں کیا ہوتا ہے؟ یہی ہوتا ہے نا! کہ چھوڑیں گے نہیں چاہے غاروں میں بھی چھپ جاؤ۔ جب تک ہمارے لئے کام کرو گے تو جیتے رہو۔ ہمارے لئے کام نہیں کرو گے تو جینے نہیں دیں گے۔

مزاجِ حکومت یہی ہوتا ہے کہ یا ہمارے لئے کام کرو یا پھر...... بیچ کی کوئی راہ نہیں ہے، یہ مسئلہ وہیں سے چلا۔ حُر کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا.....

کس چیز نے حُر کو حُرؑ بنایا؟..... حُرؑ کا ارادہ! حُرؑ کا علم، حُرؑ کی معرفت، حُرؑ کا شعور اور پھر اس علم کے ارادے میں تبدیل ہونے کی کیفیت!

یہ داخلی رزمیہ ہر فردِ بشر کے لئے ایک نمونہ ہے۔ شیطان وہاں مجسم تھا حُرؑ کے سامنے۔ ہم کیوں حُرؑ کا قصیدہ پڑھتے ہیں۔ شجاعت حُرؑ کی نشانی ہے۔ آج قاسمؑ کی شہادت کا تذکرہ ہونا ہے لیکن بحث کو مکمل کرنے کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ حُرؑ کے ارادے کی قوت نے ایک نظریہ کو شکست دی ہے۔ آپ نماز نہیں پڑھ سکتے شیطان کے وسوسوں سے .....

حُرؑ نے نماز پڑھی ہے۔ جب حُرؑ آتا ہے کربلا پہنچنے سے پہلے اور امامؑ نے راستے میں

نمازِ ظہر ادا کرنی چاہی تو پوچھا: حُر تم علیحدہ نماز قائم کرنا چاہو گے کہ میرے پیچھے نماز پڑھو گے؟

کہا: فرزندِ رسولؐ آپ نماز پڑھائیں میں آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا۔

کیا شیطان نے وسوسہ نہ کیا ہوگا؟ شیطان نے وسوسہ کیا ہوگا۔ تم انہیں گرفتار کرنے کے لئے آئے ہو۔ ان کو امام بنا کر نماز پڑھ رہے ہو۔ تمہاری شکایت کی جائے گی کہ جس کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اس کی یہ عزت افزائی کر رہے ہیں۔ حاکم تمہیں معتوب قرار دے گا، حاکم کا عتاب نازل ہوگا۔ سب کچھ سامنے آیا ہوگا نا! مگر تمام وسوسے ایک طرف، حُر کا ارادہ ایک طرف! فرزندِ رسولؐ آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

مسلسل حُرؑ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو ہر ہر مسلمان کے لئے ایک درس ہے۔

اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ امام معصومؑ کے تذکرے کو کچھ دیر کے لئے علیحدہ کر دیں تو پھر کربلا کے رزمیہ کا سب سے بڑا ہیرو عام اصطلاح میں حُرؑ ہے۔

چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ درس کے لئے، عبرت کے لئے۔ عقیدت و محبت کی زبان میں بیان ہوتے ہیں، حبیب ابن مظاہرؑ کو جب خط گیا ہے فرزندِ رسولؐ کا، حبیبؑ اپنی زوجہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرما رہے تھے کہ دق الباب ہوا۔

کہا: کون ہے؟..... کہا: برید الحسین۔

دوڑ کے آئے خط لیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ کھول کے پڑھا اور اس کے بعد کلیجے سے لگا کر بیٹھ گئے۔ بیوی پوچھ رہی ہے یہ کیا ہے کس کا خط ہے؟ فرزندِ رسولؐ کا۔ کیا لکھا ہے؟..... سر جھکا ہوا ہے۔ حبیبؑ بیوی کا امتحان لے رہے تھے۔ غیر معصوم ہیں نا! حبیبؑ کے داخل میں ایک رزم و پیکار شروع ہوئی۔

یہ عمر میری، یہ سن و سال، کوفہ میں، اپنے گھر میں عافیت ہے، امن ہے، سکون ہے۔ دوسری طرف فرزندِ رسولؐ کی آواز پر جاؤں۔ شہید ہوں گا، قتل ہوں گا۔ میرے قتل کے بعد نہ جانے میری بیوی کے ساتھ کیا سلوک ہو، کس حال میں زندگی بسر کرے۔ میرے بچوں پر کیا گزرے۔ ایک رزمیہ ہوا ہوگا۔ حبیبؑ معصوم نہیں ہیں۔ لیکن یہ حبیبؑ کا

ارادہ تھا جو غالب آیا اور حبیبؑ بھی گئے۔ حبیبؑ کا غلام بھی گیا۔ یہ انسانی ارادے ہیں۔ جو افراد..... اہل بیتؑ کے ہیں ان کی تو شان ہی کچھ اور ہے۔ باطن کا رزمیہ نہیں، داخل کا رزمیہ نہیں، اس لئے خارج کا رزمیہ بیان ہوتا ہے۔ یہاں کوئی رزمیہ نہیں ہے۔

حبیبؑ کے لئے ہے کہ کچھ دیر سر نیہوڑائے بیٹھے رہے، حرؑ کے لئے ہے کہ رات بھر ٹہلتے رہے، زہیر ابن قینؑ کے لئے ہے کہ تامل تھا۔ یہ ہم غیر معصوم خاطی و عاصی انسانوں کے لئے درس ہے مگر علی اکبرؑ نے بس اتنا پوچھا کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔

کہا: ہم حق پر ہیں۔

تو کہا: پھر موت کا کیا خوف..... ایسا نہیں ہے کہ بیٹے نے کچھ دیر سوچ کر کہا تھا..... نہیں ..... فوراً۔ اور تو اور شب عاشور چراغ گل کیا گیا۔

حسینؑ نے کہا: جسے جانا ہو چلا جائے۔

حسینؑ کو داخل کا رزمیہ دینا تھا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی ہوگی۔ حسینؑ کہہ رہے ہیں: تاریخ لکھ دے کہ یہاں شیطان کے وسوسوں کا گزر نہیں ہے۔ حسینؑ کے خیمے میں آنے کے بعد شیطان کے وسوسوں کا گزر نہیں۔

سب نے یک زبان کہا: فرزند رسول ہم چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

آپؑ نے تفصیل سے ہونے والے واقعات بیان کئے۔ سب قتل ہوں گے، لاشے پامال ہوں گے۔ اہل حرم اسیر ہوں گے۔

شہزادہ قاسمؑ نے پوچھا: میرا نام بھی محضرِ شہادت میں ہے؟

ایک مرتبہ کہا: بیٹا قاسم تیرا نام بھی محضرِ شہادت میں ہے اور چھ ماہے اصغر کا نام بھی ہے۔

فخرِ ہاجرہؓ امِ فروہؓ کو پرسہ دینا ہے۔ حسنؑ کے بیٹے کا پرسہ حسنؑ کو دینا ہے۔ رسولؐ نے کہا ہے کہ مجھے پرسہ دو، تو شہزادے قاسمؑ کا پرسہ رسولؐ کو بھی دینا ہے۔

قاسمؑ کے باطن میں کوئی رزمیہ نہیں جب پوچھا چچا میرا نام ہے یا نہیں؟ حسینؑ نے ایک سوال پوچھا: بیٹا! موت کیسی لگتی ہے؟ کہا: اھلاً من العسل....... چچا جان شہد سے

زیادہ شیریں۔

کائنات کا سارا ادب قربان قاسمؑ کے اس ایک جملے پر۔

شب عاشورہ گزری، قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایک منزل وہ آئی کہ قاسمؑ سامنے آئے: چچا جان اب اجازت دے دیں۔ آقا کو اجازت دینے میں تامل ہے۔ بار بار کہتے تھے: تم میرے بھائی حسنؑ کی نشانی ہو۔

جاتے ہیں ماں کے دامن کو تھام لیتے ہیں: اماں جان آپ نے اجازت دے دی ہے عمو جان اجازت نہیں دیتے۔

امِ فروہؓ آئیں: آقا میرے بچے کو اجازت دے دیں۔ میرے بچے کو قبول کرلیں۔

حسینؑ سے ضبط نہ ہوسکا بھتیجے کو لپٹا لیا۔ اتنی دیر تک روئے کہ حسینؑ بھی غش کرگئے قاسمؑ بھی غش کرگئے۔ اپنی طرف سے نہیں عرض کررہا ہوں، تاریخ سے پڑھ رہا ہوں۔ قاسمؑ کو رخصت کرتے وقت حسینؑ پر ایسا صدمہ تھا کہ غش کھا کر گر گئے۔

رخصت کرتے ہوئے اتنا روئے کہ غش کھا کر گر گئے۔

پھر اُٹھے پھر کلیجے سے لگایا۔ اور بالآخر کہا: بیٹا خدا حافظ۔

قاسمؑ گئے: تلوار چمکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فرزند علیؑ لڑ رہے ہوں، لشکریوں کو دور کیا لیکن موت کو شہد سے زیادہ شیریں کہنے والا قاسمؑ، شربت شہادت نوش کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ ایک مرتبہ سر پر گرز لگا، جسم اطہر پر تیر برسے۔ تلواریں پڑنے لگیں، قاسمؑ زخمی ہوتے رہے، پکارے: چچا میرا آخری سلام۔

امامؑ آگے بڑھے، دیکھا کوئی شقی ہے جو قاسمؑ کا سر قلم کرنا چاہتا ہے۔ اس شقی پر حملہ کیا۔ شقی موت سے فرار کرتا ہوا نظر آیا۔ اِدھر کی فوجیں اُدھر، اُدھر کی فوجیں اِدھر ہوگئیں۔ قاسمؑ کا لاشہ پامال ہوگیا۔

مجلس ہشتم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡھَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡھَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! قران حکیم کے سورۂ مبارکۂ روم کی تیسویں آیت مسلسل آپ کے سامنے تلاوت کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں اور اس آیۂ کریمہ کا جو بنیادی موضوع ہے وہ ہے دین اور فطرت کا اتحاد۔

آیت اس مضمون کو پیش کررہی ہے کہ دین اور فطرت میں دوئی ممکن نہیں ہے، ثنویّت کو دخل نہیں ہے۔ یہ نکتۂ توحیدی بہت دِقّت طلب ہے، ممکن نہیں ہے کہ کسی ذمہ دار عالم کا قول اس کے فعل سے مختلف ہو۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجزیہ ہوتا ہے۔ جب ہم کسی سے ملتے ہیں تو اس کی شخصیت کے متعلق سب سے اہم نکتہ جو قابلِ تجزیہ ہوتا ہے جس پر کسی شخصیت کی قدروقیمت کا دارومدار ہوتا ہے، روزمرہ کے معاملات میں، جب آپ کسی شخصیت کو پرکھتے ہیں، دو تین ملاقاتوں میں (ابھی عالم سے نیچے ہی رہیے) تو آپ یہ

دیکھتے ہیں کہ یہ شخص جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ یا اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد ہے۔ بنیاد اسی پر ہوتی ہے نا! کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہی کرتا ہے یا کہتا کچھ اور ہے کرتا کچھ اور ہے۔ دعویٰ کچھ کرتا ہے عمل کچھ اور کرتا ہے۔ وعدہ کی وفا کرتا ہے یا نہیں۔

قول و فعل کے اتحاد کا ایک نام ہے وفا۔ اور یہ وہ قدرِ بنیادی ہے، یہ وہ نفیس ترین اخلاقی قدر ہے جو آپ تلاش کرتے ہیں ہر فردِ بشر میں۔ آپ کو آفس میں کسی کو ملازم رکھنا ہے تو آپ دیکھیں گے، اس کا انٹرویو کریں گے۔ کہیں یونیورسٹی میں کسی کو پروفیسر بنانا ہے انٹرویو ہوگا۔ اب وہ جو کچھ بھی آپ انٹرویو میں کرتے ہوں لیکن ذہن انسانی میں، انسان کی نفسیات نے اس طریق کار کو مقرر ہی کیوں کیا؟

پی ایچ ڈی، کی کسی نے۔ اس کا لکھا ہوا مقالہ ممتحنین نے پاس کردیا۔ کچھ یونیورسٹی کے داخلی ممتحن تھے کچھ خارجی تھے (یہ خارجی فارسی زبان کی اصطلاح میں کہہ رہا ہوں اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں نہیں) تھیسس THESIS لکھا اور بھیج دیا گیا اب انہوں نے کہا کہ یہ مقالہ بالکل اس قابل ہے کہ پی ایچ ڈی Award کردی جائے۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ viva، Interview، مقابلہ یا مصاحبہ کچھ experts آئیں گے اور اس (مقالہ لکھنے والے) سے گفتگو کریں گے تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ جو کچھ لکھا ہے اسے اچھی طرح سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ جو لکھا ہے کچھ کرکے لکھا ہے یا یونہی لکھ دیا ہے..... مانگے کا اجالا تو نہیں ہے۔ تو زندگی کے ہر شعبے میں آپ کسی کو سرٹیفکیٹ دینے کے لئے، کسی پر اعتماد کرنے کے لئے، کسی کو ملازمت دینے کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو اور جہاں کسی بھی شخص کے قول و فعل میں ذرا بھی تضاد نظر آیا وہ آپ کے معیار سے گر جاتا ہے۔

جب عام انسان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوسکتا تو پھر ایک عالم، اس کے قول و فعل میں تو تضاد ہونا ہی نہیں چاہئے۔ اور اگر کسی عالم کے قول و فعل میں دوئی نظر آتی ہے تو دو ہی سبب ہیں۔ یا کوئی واقعاً مجبوری ہوگی جس مجبوری پر قابو پانے کی قدرت اس میں

نہ ہوگی یعنی علم تو ہوگا مگر قدرت نہ ہوگی۔ یہ ہے عام عالم کے زمرے کی بات۔ عام سطح زندگی میں ایک انسان جب علم حاصل کرتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ علم و قدرت کا توازن بھی اس کی شخصیت میں پایا جائے۔ ممکن ہے کہ علم ہو لیکن قدرت اتنی نہ ہو کہ اپنے ہی علم کے تمام تقاضوں کو پورا کرسکے۔ ایسا ممکن ہے۔ اُس موقع پر وہ معذور ہے۔

علم ہے جانتے ہیں مگر مجبوری ایسی تھی، حالات ایسے تھے، مسائل ایسے تھے، پابندیاں تھیں، گرفتاریاں تھیں عمل نہ ہوسکا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پھر آپ اس کے علم پر ہی شبہ کریں کہ واقعاً علم ہے بھی یا نہیں؟ زبان پر کچھ اصطلاحیں چڑھی ہوئی ہیں۔ کچھ definitions رٹ لی ہیں، سمجھا نہیں ہے۔ اس لیے کہ دل میں اگر یہ نورِ علم اتر جاتا تو ناممکن تھا کہ علم ہوتا اور عمل اس کے برخلاف ہوتا۔

جب عام انسان کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہوسکتا، ایک عالم کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہوسکتا تو وہ ربِّ کریم، اس کے قول وعمل میں کیسے دوئی اور تضاد ہوسکتا ہے جو اس نے کہا وہ ہے دین جو اس نے کیا وہ ہے کائنات اور فطرت.......... دونوں میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ دین کا کوئی اصول، کوئی قانون، کوئی فلسفۂ دین حقیقتِ وجودیہ سے مختلف ہوجائے۔ چنانچہ اس آیۂ کریمہ میں

فاقم وجهك للدين حنيفا o فطرت الله التى فطر الناس عليها o

یہی نکتہ ہے کہ دین وفطرت میں دوئی نہیں ہے، ثنویت نہیں ہے لیکن اسی وحدت کو دریافت کرنے کے لئے میں مسلسل گزارش کررہا ہوں کہ حقیقت علم کا اجاگر ہونا ضروری ہے۔

علم و ارادہ کی بحث تک کل گفتگو پہنچی بلکہ گزشتہ دو تین روز سے علم اور ارادہ کی گفتگو چل رہی ہے۔ یہ گفتگو صرف ذہنی مسائل سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ صرف ذہنی مسائل ہیں یہ۔ ارادہ اگر ذہنی مسائل سے کہیں بھی مربوط ہوتا ہے تو وہ غیر

مرئی پہلو ہے اس کا۔ ارادہ کا زیادہ تعلق آپ کے عمل سے ہے، آپ کی عملی زندگی سے ہے۔

کل میرے عزیز نے، ایک محترم مومن نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں منبر سے عملی درس ملے۔ یہی تنہا منبر ہے کہ جہاں بے عملی کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی stage سے ایسی آواز بے عملی کے خلاف نہیں اٹھائی جاتی جیسے یہاں سے اٹھتی ہے۔ منبر حسینی۔ ہماری ہر فکر عمل کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہیے یہاں تک کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

العلم یَھْتِفُ با العملo

اگر عمل آ گیا تو علِم بھی ٹھہرتا ہے اور اگر عمل نہ ہوا تو پھر علِم رخصت ہو جاتا ہے۔ دوئی نہیں ثنویت نہیں یہ بھی تعبیر ہے ورنہ علِم ممکن نہیں ہے کہ عمل سے جدا ہو جائے جب تک کہ علِم کا مرتبہ ضعیف نہ ہو اور جس کے پاس علِم ہے وہ عاجز نہ ہو۔ اسی لئے جہاں علِم بھی ہے اور قدرت بھی ہے وہاں ممکن نہیں ہے کہ ثنویت کو دخل ہو جائے۔ ممکن ہی نہیں ہے۔ نظریہ علِم کا واضح ہونا ضروری ہے۔

دو تین تقریروں سے میں کہہ رہا ہوں کہ ایک نکتہ بھی واضح ہو گیا تو ایک پورا نظامِ فکر مُنظّم ہو جائے گا۔ کیوں عرض کر رہا ہوں؟........ یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے، اپنی کسی بات پر اصرار نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ماہیت وحقیقتِ وجودیہ علِم آپ کی نظر میں آجائے تو یہ نکتہ خود روشن ہو جائے گا۔

علِم نور ہے۔ حدیث محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، مشہور حدیث ہے، میں اس منبر سے پڑھ چکا ہوں۔ اکثر سنتے رہتے ہوں گے "العلُم نور"۔ علِم نور ہے۔

یَقذفُہُ اللّٰہ فی قلب من یشاء

اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے یہ نور، یہ علِم ڈال دیتا ہے۔

نور کی جب تعریف علِم ہے تو بتایئے نور کی خصوصیت کیا ہوتی ہیں؟ کتنی ہی تاریکی

ہو، کیسی ہی تاریکی ہو، نور کی ایک کرن بھی آئے گی تو پورے ماحول کی تاریکی کمزور پڑ جائے گی، تاریکی کا رنگ کٹنے لگے گا، ایک کرن بھی اگر آئی۔ یعنی نور محدود نہیں ہوسکتا، نور مقید نہیں ہوسکتا، نور کو کسی سمت میں مقید کرنے کے لئے، کسی سمت کا، کسی direction کا پابند بنانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔ آئینہ بندی کرنی پڑے گی۔ شعاعیں بکھریں نہیں، ایک ہی طرف کو شعاعیں جائیں۔ اور اگر نور پر پابندیاں نہیں ہیں، اگر نور کو منعکس کرنے والے آئینے نہیں ہیں تو نور ہر سمت میں پھیلے گا، کسی ایک سمت میں محدود نہیں ہوسکتا۔

اگر علم کی یہ حقیقت ذہن میں آجائے۔ کیوں کہہ رہا ہوں؟ نظریہ علم کی کتنی اہمیت ہے یہ سمجھیں۔

اگر نظریۂ علم ہی مادی ہے اگر نظریہ علم ہی ظلمانی ہے، اگر نظریۂ علم ہی میں تاریکی ہے تو پھر کائنات میں تاریکی ہی تاریکی نظر آئے گی اور اگر آپ کا نظریۂ علم مصطفوی ہے، اگر آپ کا نظریہ علم مرتضوی ہے، اگر آپ کا نظریۂ علم الٰہی ہے، اگر آپ کا نظریہ علم قرآنی ہے، اگر آپ کا نظریۂ علم برہانی ہے تو پھر آپ یہ تسلیم کرلیں کہ اگر علم نور ہے تو پھر اسے مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اور کوئی ایک کرن بھی علم کی آگئی تو پھر تمام اطراف و جوانب کو روشن کرتی چلی جائے گی۔ اور ایک مکمل نظامِ حیات سامنے آجائے گا، ایک مکمل نظام فکر سامنے آجائے گا۔ اس میں کوئی غلو اور مبالغہ نہیں ہے، استغراق نہیں ہے۔ اس بات کو exaggerate کرکے پیش کیا جارہا ہے ایسا نہیں ہے۔

ایک نکتۂ علمی بھی اگر روشن ہوگیا تو اس کے اطراف و جوانب بھی روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر حقیقتِ علم روشن ہوگئی اگر حقیقتِ ارادہ روشن ہوگئی تو پھر دوسرے علوم کی تعریفات بھی حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ علم ایک بسیط حقیقت ہے۔ علم تقسیم ناپذیر حقیقت ہے، علم مُجرد حقیقت ہے۔ صرف اس میں مراتب کا تفاوت ہے۔ یہ بات پہلے بھی کہی ہوگی میں نے، میرے دلچسپ موضوعات میں سے ہے۔ آج بھی کہہ رہا ہوں لیکن

اس کے معنی کیا ہیں؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس کو اس علمی اور فلسفیانہ اور scientific حقیقت سے مربوط کریں کہ ہمارے یہاں تو علوم کی قسمیں ہیں۔ کچھ علومِ دین ہیں اور کچھ کو کہتے ہیں علومِ دنیا۔ یہ میری تقسیم نہیں ہے..... علوم کی قسمیں ہیں classification ہے science کی، knowledge کی branches ہیں۔ تقسیم علم پر بعض مفسرین نے توجہ دی ہے کہ علم تقسیم کیسے ہوتا ہے۔ اس کی دستہ بندی کیسے ہوئی۔ ارسطو نے بہت پہلے علم کو تقسیم کیا تھا کہ فلسفہ دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے ایک فلسفۂ نظری ایک فلسفۂ عملی۔ اس کے بعد پھر فلسفۂ نظری تقسیم ہوتا ہے الٰہیات و ریاضیات وطبیعیات وغیرہ، وغیرہ میں اور اُدھر فلسفۂ عملی میں علمِ اخلاق اور علمِ تدبیرِ منزل اور علمِ سیاستِ مُدُن۔

علم کی تقسیمات ارسطو نے کیں اور وہ چلی آرہی ہیں اب تک ایک مکتبۂ فکر میں۔ اس کے بعد پھر کچھ دوسرے لوگوں نے علم کی دوسری اقسام کی تقسیم کی۔ انسائیکلوپیڈیا لکھنے والوں نے اپنے انداز سے نالج کی classification اور branches کو مقرر کیا اور اس میں رتبے مقرر کئے۔ اور ادنیٰ سی مثال اور دے دوں کہ library science نے جب ترقی کی تو مسئلہ اتنا سا تھا کہ کتابیں کس ترتیب سے رکھی جائیں، انہوں نے اپنے انداز سے ایک نئی classification کی۔ رکھنا تھا کتابوں کو ترتیب سے بانٹ ڈالا علم۔ جیسے ہمارے سیاستداں کرتے ہیں۔

انسانیت کی قدر تو کر نہیں پاتے، انسانوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ انسانوں کو تقسیم کر دیا۔ اب بکھرے ہوئے انسانوں کو مجتمع نہیں کر سکتے تو بانٹتے ہیں، گروپ بنا دیتے ہیں۔ پارٹیاں کیسے وجود میں آتی ہیں، یہ فرقے کیسے وجود میں آتے ہیں، یہ مختلف مسلک کیسے وجود میں آتے ہیں؟......... ارے بھائی! انسانیت تقسیم ناپذیر ہے۔ انسانیت کی فکر کرو اور انسان کی۔ یہ مغربی انسان اور یہ مشرقی۔ اور یہ اس ملک کا انسان اور وہ اس ملک کا انسان اور پھر انسانوں کی قدر و قیمت ایسی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کا ایک انسان مر گیا تو

کسی اور ملک کے سارے انسانوں کا خون مباح۔

آپ کے ملک میں اتنی جرأت تھوڑی ہے یہ کسی اور ملک کی بات ہورہی ہے (میں مہمان ہوں مجھے ایسی بات کہنی نہیں چاہئے تھی مگر یقین کیجئے طنزاً نہیں ہمدردی سے کہی ہے۔طنز کرنے کا عادی نہیں ہوں)۔

بہرحال ہیں کچھ جبابرۂ وقت، اگر ہمارے ملک کا کوئی سفید پوست ایک آدمی بھی مرگیا تو اس کی قیمت بہت زیادہ ہے اور دوسرے ملک کے ہزاروں افراد مرگئے کوئی قیمت نہیں ہے۔تو انسانیت کی قدر نہیں، انسان کی قدر نہیں ہے۔ ملک classified ہوگیا ہے۔ سیاسی سرحدیں، جغرافیائی سرحدیں، رنگت کے حوالے سے سرحدیں، زبان کے حوالے سے سرحدیں، تہذیبوں کے حوالے سے سرحدیں ، مذہبوں کے حوالے سے سرحدیں ،سرحدیں گھٹائی نہیں جارہی ہیں روز بروز بڑھائی جارہی ہیں۔

آپ کہیں گے یہ ذہنی مسائل ہیں؟......... یہ تو ہماری زندگی کے عملی مسائل ہیں۔

بات ہورہی تھی علم کے classification کی آ گئی انسانوں کی تہذیب کی بات۔

تو علم کو مختلف نکتۂ نظر سے بانٹا گیا، تقسیم کیا گیا۔ میں عرض کررہا ہوں کہ اگر نظریۂ علم درست ہوتو علم کے صحیح تقسیمات چاہے وہ مجازی ہوں سمجھ میں آئیں گے۔ اور ان تقسیمات کو تقسیمات نہ کہہ کر مراتب علم قرار دیا جائے گا۔یعنی نقطۂ نظر کو بدلیں۔ معاف فرمائیں گے وہ حضرات کہ جو علمی مسائل سے روزمرہ کی زندگی میں زیادہ وابستہ نہیں ہیں..... وہ بھی قابل مبارکباد ہیں کہ جو اپنی محنت کی، مزدوری کی زندگی سے کسب حلال کررہے ہیں۔ بہت سے بے عمل علماء سے وہ افضل ہیں۔

ایک مزدور کا ایک قطرہ پسینہ بڑی قدرو قیمت رکھتا ہے نگاہ پروردگار میں ، وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان سے ملتفت نہیں ہوں ، مخاطب نہیں ہوں۔ ایسا نہیں ہے مگر میں بعض باتیں ان دانشور ذہنوں تک پہنچانا چاہتا ہوں جو مزدوروں کے پسینے کی قدر نہیں جانتے۔

یعنی اگر نظریۂ علم درست ہے یعنی اگر theory of knowledge درست

ہے، اگر علم کو نور سمجھ رہے ہیں تو پھر علم کی تقسیم کیسے کریں گے؟....... یہ نہیں کہیں گے علم کی تین قسمیں ہیں، علم کی تیس قسمیں ہیں، علم کی تین سو قسمیں ہیں۔ قسمیں نہیں کہیں گے۔ کہیں گے علم کے مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ فقہ ہے اس سے بلند مرتبہ اخلاق ہے، اس سے بلند تر مرتبہ عرفان ہے..... یعنی ہے ایک ہی شے، ضعیف سے قوی ہوتا چلا جائے گا تو نام بدلتا جائے گا۔

مرتبے بڑھتے چلے جائیں گے۔ جب ضعیف تر ہوگا علم تو سلمانؓ کہلائے گا، قوی تر ہوگا تو علیؑ کہلائے گا۔ اور قوی تر ہوگا تو محمدؐ کہلائے گا اور قوی تر ہوگا تو جس نام سے پکارو سارے اچھے نام اُسی کے ہیں۔

یہ نظریہ علم کی بات ہے کہ علوم میں مراتب ہیں تقسیمات نہیں ہیں۔ اور اسی طرح کون علم افضل ہے کون مفضول خود ہی سمجھ لیجئے۔ جو علم زمین سے متعلق ہے زمینی کہلائے گا۔ جو اس کی حیثیت ہے وہی ہوگی۔ جو علم آسمان سے متعلق ہے وہ آسمانی کہلائے گا۔ علم تقسیم ناپذیر ہے۔ علم کے مرتبے ہیں۔ اب فزکس کی اپنی جگہ اہمیت ہے، کیمسٹری کی اپنی جگہ اہمیت ہے، جیولوجی کی اپنی جگہ اہمیت ہے، دوسرے علومِ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن جو انسانی روح سے متعلق علوم ہوں ان کا رتبہ یقیناً ان سب سے بڑھ کر ہوگا۔ توہین کسی علم کی نہیں ہے اس کی حیثیت کو سمجھنا ہے کہ اس کی سرحد کہاں تک ہے۔

مراتب ہیں علم میں تقسیمات نہیں، اور جب یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو پھر تعریفات بدل جائیں گی۔ میں نے ایک یا دو روز قبل علامہ محمد بہاء الدینی کا ایک جملہ آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ ''فقہ مقدمہٗ اخلاق ہے۔'' اسی جملے سے واضح ہوگیا کہ وہ مرد فقیہ، وہ عارف بتا رہا تھا کہ فقہ پہلے مرتبہ پر ہے اور اخلاق اس سے بلند تر مرتبہ پر اور اسی سے سمجھئے کہ اخلاق کی حیثیت کیا ہے اور عرفان اس سے بلند تر۔ اس لئے کہ اخلاق ہے مقدمہٗ عرفان۔

میں نے دو ایک مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ

کے ذہنوں میں ہوگا کہ فقہ کس طرح مقدمہ اخلاق ہے۔ آج لفظوں کو بدل کر بات کو مزید ذہن نشین کرنے کے لئے ایک بات عرض کر رہا ہوں۔ دیکھئے انسان کی زندگی میں کچھ قدریں ہیں، کچھ تقاضے ہیں۔ ان قدروں کو محفوظ رکھنے کے لئے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے انسان ایک ضابطے کا پابند بنایا گیا ہے۔

ضابطہ بنایا کب جاتا ہے، قانون بنایا کب جاتا ہے؟ آئے دن parliments میں قوانین بنتے ہیں........کیوں بنتے ہیں؟..........آج دنیا کی ہر حکومت terrorism کے خلاف نئے نئے قانون بنا رہی ہے۔ کیوں؟........ جب terrorism بڑھا تو اس کو گرفت میں لینے کے لئے قانون کی ضرورت ہوئی۔ اگر یہ بے امنی وجود میں نہ آتی تو قانون بنانے کی فکر پیدا نہ ہوتی یعنی جب کسی قدر کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو قانون کا سہارا لیا جاتا ہے یا جب کسی حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، جب کسی فرد کے مکمل نہ ہونے کا اندیشہ ہو تو قانون کا سہارا لیا جاتا ہے۔

اگر معلوم ہے کہ سب لوگ نیک ہیں، شریف ہیں کوئی بے امنی نہیں ہوگی تو یقین مانیئے کہ ایک بھی کانسٹیبل یا پولیس مین نظر نہیں آئے گا لیکن جہاں یہ اندیشہ ہو کہ بے امنی ہوسکتی ہے وہاں forces لگ جائیں گی۔ کیوں لگیں گی؟..... اس لئے کہ اندیشہ تھا بے امنی کا..... قانون اور ضابطہ کیوں بنا اس لئے کہ وہ قدرِ انسانیت کو محفوظ رکھ سکے۔ تو اب دو سطحیں ہوں گی انسانوں کی۔ کچھ وہ ہوں گے کہ جب تک قانون کے سانچے میں انہیں ڈھالا نہ جائے ان میں اخلاقی قدریں پنپ نہیں سکتیں اور کچھ وہ ہوں گے کہ جن کو دیکھ کر قانون بنایا جائے گا۔

اخلاقی قدروں کا تصور کہاں سے آئے گا؟...... اللہ تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے۔ تخلقوا باخلاق اللّٰہ ہمارے منبروں سے کہا جاتا ہے، مسجدوں سے کہا جاتا ہے، خانقاہوں میں اسی فقرے کا ورد ہوتا ہے، کہ اللہ کے اخلاق کو اختیار کرو....... اللہ تعالیٰ تو عرش پر تشریف فرما ہیں۔ کون جا کر ان کے بغل میں کرسی پر بیٹھا؟ کس کو اللہ تعالیٰ نے

چائے کے لئے مدعو کیا؟ کس کو اللہ نے شربت عطا فرمایا؟ ہمارے یہاں تو چائے اور شربت پر اخلاق محدود ہے نا! اللہ تعالیٰ کا اخلاق کس نے دیکھا؟......اب کچھ ایسے پیکر ہیں کہ جنہیں دیکھ لو تو اخلاقی قدریں سمجھ میں آجائیں۔ اب سمجھئے علمِ فقہ۔ علم شریعت وہ سانچہ ہے جو خطا کار انسانوں کو بے خطا بنانے کے لئے بنایا گیا اور علم فقہ وہ سانچہ ہے جو بے خطا معصوم انسانوں کو دیکھ کر بنایا گیا۔

ایک طرف وہ معصوم انسان ہیں، ایک طرف وہ پیکر اخلاق ہیں کہ جنہیں دیکھ دیکھ کر قانون بنایا گیا۔ یعنی کسی کی سیرت ہے ہمارے لئے قانون۔ ان کے لئے اخلاق ہے ہمارے لئے قانون۔

اب علِم اخلاق کی ایک تعریف عرض کر رہا ہوں۔ ایک definition۔ علِم اخلاق وہ ہے کہ نفس میں وہ ملکہ پیدا ہو جائے (کاش الفاظ محفوظ رہ جائیں.....کتابوں میں جو لکھا ہے وہ نہیں دہرا رہا ہوں چار ہزار برس سے کتابوں میں علِم اخلاق کے لئے کیا definition ہے وہ نہیں عرض کر رہا ہوں) علِم اخلاق یہ ہے کہ نفس میں وہ ملکہ پیدا ہو جائے کہ انسان سے کوئی فرض چھوٹنے نہ پائے، کوئی حق ضائع نہ ہونے پائے۔

حق اور فرض کی بحث قانون کے دائرے میں ہوتی ہے۔ شریعت میں ہوتی ہے، پارلیمنٹ میں روزانہ حقوق کے مطالبے ہوتے ہیں۔ حقوق کو پرکھا جاتا ہے، ناپا جاتا ہے، تولا جاتا ہے اور اس کے بعد قانون بنائے جاتے ہیں، فرائض مقرر کئے جاتے ہیں، duties مقرر کی جاتی ہیں۔

قانون دیکھ کر جو حق وفرض کو پہچانے وہ الگ انسان ہے اور جس انسان کو دیکھ کر حق وفرض سمجھ میں آئے وہ الگ انسان ہے۔ دونوں کو ایک جیسا کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ مصطفیٰؐ اس انسان کا نام ہے جسے دیکھ کر حق وفرض سمجھا گیا، یہ اس کے لئے انکساری کا مرتبہ تھا کہ کیا کہا:

قل انما انا بشرٌ مثلکم o ارے! میں تمہارا جیسا بشر ہوں ورنہ کہاں تم اور

کہاں مصطفیٰؐ ۔

بحث سنگین ہے ذہنوں تک منتقل ہو رہی ہے اس میں میرا کمال نہیں ہے یہ تو منبر کی اس نسبت کا کمال ہے جو حسینؑ سے ہے۔

عزیزو! حوزہ ہائے علمیہ میں ان بحثوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے خون تھوکنا پڑتا ہے۔ فلاسفی کی کلاسز میں مہینوں گزر جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا اور آپ ایک گھنٹے اور چند جملوں کے دوران باتوں کو سمجھ لیتے ہیں۔ خدا آپ کی ذہانتوں کو پروان چڑھائے اور اس مکتب کو ہمیشہ آباد رکھے کہ جس مکتب میں یہ ذہانتیں پروان چڑھتی ہیں۔

ایک طرف وہ افراد ہیں کہ جنہیں دیکھ کر اخلاق و فرائض معین کئے گئے۔ ایک طرف وہ ہیں جو اخلاق و فرائض پڑھ پڑھ کر سیکھتے ہیں۔ کہ فرائض کیا ہیں، حقوق کیا ہیں۔

اخلاق وہ مَلکہ ہے کہ جو نفسِ انسانی میں راسخ ہو جائے۔ یعنی سامنے قانون ہو یا نہ ہو نفس بے قانونی نہ کرے۔ یہ بات تصور میں آ رہی ہے یا نہیں؟ سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں؟...... کہ ایک ایسا انسان بھی ہوسکتا ہے کہ جس کے سامنے قانون نہ ہو مگر وہ بے قانونی نہ کرے۔ ایسے افراد ہوتے ہیں معاشرے میں۔ انہیں قانون معلوم نہیں ہے مگر وہ غلط کام نہیں کرتے اس لئے کہ ان کی فطرت صحیح ہوتی ہے۔ اگر فطرت درست ہو تو پھر قانون کی ضرورت نہیں ہوگی اور ایک صاحبِ فطرتِ سلیم جیسی روشِ زندگی اختیار کر لے وہی قانون بن جاتا ہے۔ اسی لئے سیرتِ محمد مصطفیٰؐ سرچشمۂ قانون ہے۔

ہمیں جب قرآن سے کوئی حکم نہیں ملتا تو دیکھتے ہیں کہ مصطفیٰؐ نے کیا کیا وہی قانون اور بہت سی زندگی کے مسائل ایسے ہیں جو حضورؐ کی ظاہری زندگی میں نہیں ملتے۔ اب دنیا والوں سے پوچھیں کہ ایسے مسائل جب سامنے آ جائیں کہ نہ قرآن میں صاف صاف نظر آئے، نہ سیرت کے پیکر میں ملیں تو پھر کس سے ملیں گے؟ کیا فطرت عقیم ہوگئی؟ یا اس نے نفسِ مصطفیٰؐ کی شکل میں کسی کو دنیا کے سامنے بھیج دیا کہ اگر تم سے قانون نہ بن رہا ہو تو اسے دیکھ لو کہ اس نے کیا کیا اور قانون بنا لو۔

■ ■

تو ہے ایک سلسلہ کہ اگر پیغمبرؐ کی سیرت میں کوئی چیز نہ ملے تو پھر معصوموں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیغمبرؐ کی حدیث ہے اور عظیم الشان کتاب صحیح بخاری میں ہے، فرماتے ہیں: لا یزال ھذا الدین عزیزاًo یہ دین سربلند رہے گا، پُرقوت رہے گا، بلند و بالا رہے گا، باعزت رہے گا جب تک اس میں میرے بارہ جانشین رہیں گے۔ بتادیا کہ یہ بارہ وہ ہیں جو مجھ سے مِنّیت کی نسبت رکھتے ہیں۔ اگر میری سیرت میں قانون نظر نہ آئے تو ان کی سیرت دیکھ لینا۔

یہ جو سیرتیں ہوتی ہیں یہ قانون کی محتاج نہیں ہوتیں، قانون ان کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ سیرتیں، معصوم سیرتیں ہوتی ہیں۔ اور کچھ تو وہ ہیں کہ جو علمِ لدُنّی رکھتے ہیں۔

ہمارے سامنے تو ایسی سیرتیں بھی ہیں کہ جو عہدہ الٰہی نہیں رکھتیں، منصب خداوندی پر نہیں ہے، نبوت پر فائز نہیں ہیں، امامت پر فائز نہیں ہیں، وصایت پر فائز نہیں ہیں مگر تاریخ آج تک ان کے کردار میں کوئی کمی تلاش نہ کرسکی اور بعض ایسے اخلاقی اصول اور معیار ہیں کہ جن کے لئے شریعت میں کوئی قانون بھی نہیں ہے مگر اگر قانون بنانا چاہو گے تو ان کی سیرت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا پڑے گا۔

انہیں ہم محفوظ عن الخطاء کہتے ہیں۔ وہ وہ ہیں جو خطا سے محفوظ رہے، جن سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ وہ کون ہیں؟ میں بتاؤں؟ یا آپ بتائیں گے یا دے دیں اِذنِ عام کہ جا کر تاریخ بشر میں تلاش کرو۔

ایسے اخلاق کے پیکر کہ جن سے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہ ہوا۔ تقریر کے شروع میں، میں نے ایک کلمہ کہا تھا ''علم و عمل میں دوئی ممکن نہیں ہے'' علم و عمل کے اتحاد کا نام ہے وفا۔ قانونِ شریعت میں بتاؤ، وفا کے کتنے قانون ہیں، وفا کی کیا definition ہے، وفا کی کتنی سرحدیں ہیں، وفا کے کتنے مراتب ہیں، وفا کے کتنے تقاضے ہیں۔ قران مجید میں لفظ وفا آیا ہے۔ قران مجید میں وفا کا حکم ہے ..... کہاں؟..... سورۂ مبارکہ مائدہ۔

یا ایھا الذین امنوا اوفوا بالعقودo

اے ایمان لانے والو! اپنے عہد و پیمان کی وفا کیا کرو۔

آپ کہیں گے یہ فقہ کے دائرے میں نہیں ہے، ہم کہیں گے اخلاق کی جان ہے۔ بہت سنگین ہوگئی بحث۔ میری آواز بھی سنگین تھی بحث بھی سنگین ہوگئی مگر میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ بہرحال انسان عادت کا پابند ہوجاتا ہے۔ وہ انسان کوئی اور ہوتا ہے جو تصرف کرے تو دوسروں کی عادتیں بھی بدل دیتا ہے۔ میں بہت گنہگار انسان ہوں اور ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اس لئے بحث سنگین ہوگئی لیکن ایک اہم حقیقت کو سمجھنے کے لئے۔

اخلاق وہ مَلکہِ ہے کہ جو کوئی حق ضائع نہیں ہونے دیتا۔ کوئی فرض چھوٹنے نہیں پاتا وہ مَلکہِ ہے چاہے سامنے شریعت ہو یا نہ ہو۔ اخلاق کی تمام صفتوں میں بنیادی صفت کیا ہے؟...... پھر میں ذرا اختلاف کررہا ہوں۔ عام طور پر کہا گیا کہ تین بنیادوں پر اخلاق قائم ہے۔ شجاعت، حکمت، عفت، بالکل درست ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے لیکن ایک نئے زاویے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے، کہ تمام مسائلِ اخلاق کا محور ایک ہے وفا..... مبالغہ نہیں ہے۔ علمی انداز میں سوچئے گا۔ فکری انداز میں سوچئے گا، فلسفیانہ انداز میں سوچئے گا اور غالبؔ بن جایئے گا تب بھی یہی بات سمجھ میں آئے گی۔

وفا داری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

اس سے زیادہ سچا مصرعہ پوری اردو شاعری میں کہا نہیں گیا۔ اس سے زیادہ محکم اور سچا کوئی دوسرا مصرعہ آپ کو نہیں ملے گا۔ وفاداری بشرطِ استواری۔ مستقیم ..... صراطِ مستقیم ..... بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے۔

تمام مسائلِ اخلاق ایک قدرِ وفا کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اور وفا کے بارے میں اگر سوچتے چلے جائیں تو ایک نئی سطح علمی قائم ہوجائے۔ ایک نئی جہت سامنے آجائے۔

قران مجید نے کہا: یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود٥

اے ایمان لانے والو! جو عہد و پیمان کرو، جو agreement کرو، جو معاملہ کرو اس کی وفا کرو۔ تو یہ حکم شریعت بھی ہو تو گیا۔ حکم شریعت ہے یعنی اب واجبات میں سے

ایک اہم واجب ''وفا'' بھی ہے۔ ایک واجب نماز، ایک واجب روزہ، ایک واجب حج، ایک واجب زکوٰۃ، ایک واجب خمس، ایک واجب جہاد، ایک واجب وفا۔

وفا واجبات میں گِنیں گے یا نہیں؟ ''اوفوا'' امر کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں یہ معاملات سے متعلق ہے سبحان اللہ! ارے جس سے بھی پیمان باندھو..... اسی لئے نماز کی عرفانی تعبیر میں یہ بھی ہے کہ نماز کیا ہے؟...... خدا سے وفا!

نماز کیا ہے؟...... کلمہ توحید۔ لا الہ الاّ اللہ سے وفا۔ روزہ کیا ہے؟...... پروردگار سے عہدِ اخلاص کی وفا! جہاد کیا ہے؟...... اس سے وفاداری کے وعدے کی وفا۔ اور وفا کی بھی قسمیں ہیں۔ عملی زندگی میں انسان اگر ایک قدرِ وفا پیدا کر لے تو اس کی زندگی بہشت بن جائے۔

اب دیکھئے یہ عملی بات ہے یا ذہنی۔ سب سے پہلے انسان اپنی ذات سے تو وفا کرے۔ اپنے دل سے جھوٹ نہ بولے، اپنے دل کی سچی بات سنتا رہے۔ دل جھوٹ نہیں بولتا، نفس جھوٹ نہیں بولتا، ٹوکتا رہتا ہے ہر انسان کا نفس داخل سے۔ اگر قدم غلط سمت میں اٹھایا دل پکارے گا غلط اٹھا رہے ہو قدم۔ اب دل کو فریب نہ دو اگر تم اپنی ذات سے وفا کر رہے ہو۔

اپنی ذات سے وفا۔ گھر کو جنت بنانا ہے تو بیوی سے وفا، بیوی کی شوہر سے وفا۔ ازدواج کے رشتے میں وفا۔ وفا سے بڑھ کر زندگی کے لئے کوئی نسخہ نہیں ہے جو بہشت بنا سکے اور بے وفائی سے بڑھ کر کوئی سبب نہیں ہے کہ زندگی جہنم بن جائے۔ جہاں زن و شوہر کے درمیان بے وفائی کا شبہ آیا زندگی ختم۔ انکحتُ کا عقد کوئی اثر نہیں رکھتا جب تک دلوں کا عقدِ وفا نہ ہو۔

باپ اور بیٹے میں، اولاد اور والدین میں سب سے اہم چیز وفا..... دوست کسے کہتے ہیں؟..... دنیا والے مجھے دوست کی تعریف تو بتائیں۔ اعزا اور اقرباء کے دائرے سے نکل کر دوست وہ ہوتا ہے جس میں ہو قدرِ وفا.....

دوست کسے کہتے ہیں جو بڑا عالم ہو؟.....ہرگز نہیں۔
دوست کسے کہتے ہیں جو بڑا شجاع ہو؟.....
دوست کسے کہتے ہیں جس میں عفت پائی جائے؟
دوست کسے کہتے ہیں جو بڑا غیور ہو؟
غیور ہونا ایک صفت ہے مگر دوستی کی بنیاد یہ صفت نہیں بن سکتی۔
علم ایک صفت ہے مگر دوستی کی بنیاد نہیں بن سکتی،
عفت ایک صفت ہے مگر دوستی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

دوستی کی بنیاد ہے وفا۔ اور وفا کے اقسام ہیں قران کے حوالے سے۔ ایک جو سورۂ مائدہ کے مطلع میں کہا گیا:

یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود○ اے ایمان لانے والو! عہد و پیمان کی وفا کرو۔

اور اسے ہمارے فقہا نے بیشتر معاملات سے جوڑا۔ کہ جب تجارت کرو، جب کوئی عقد ہو جائے، جب نکاح ہو، تو کہا کہ عقود کی بنیاد ہے وفا۔

ہماری نظر سے ایک حدیث گزری۔ خدا آپ کے جذبۂ ایمانی کو فروغ دے۔ حدیث میں ہے کہ یہ آیت میں عقود جمع کا صیغہ کیوں آیا؟ اور بتایا کہ معصوم نے کہا کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے دس مرتبہ (دس جمعِ کثرت ہے قلت نہیں) جبرئیلؑ آئے اور کہا:

یا رسول اللہ اپنی امت سے اپنے کلمہ گویوں سے علیؑ کی ولایت کا عقد کر لیجئے۔

جب دس مرتبہ عقدِ ولایت ہو چکا تو کہا:

یا ایھا الذین آمنو اوفوا بالعقود○ یہ جو دس مرتبہ عقد باندھا ہے اس کی وفا کرو۔

دس مرتبہ جبرئیلؑ جب آ چکے اور بار بار دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر اور اس کے بعد جو جو ایمان لاتا گیا کہا ان سے ولایت کا عقد کر لیجئے، عہدِ ولایت لے لیجئے۔ جب دس مرتبہ آ چکے تو اب ایک عام حکم آیا:

یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود ۝ اپنے عہد و ایمان کی وفا کرو۔

یہ عہد معاملات سے بھی ہے، عبادات سے بھی ہے، ولایت سے بھی ہے۔ ولایت کے مسائل سے بھی مربوط ہے۔ یہ نہیں کہہ رہا ہوں صرف اسی سے مربوط ہے۔ یک جہت نہ ہو جائے نظر۔ ایک یہ ہے مگر دوسرا مقام۔ وفا عہد کی ہوتی ہے، وفا پیمان کی ہوتی ہے، وفا نذر کی ہوتی ہے۔

مثال دے رہا ہوں کہ کسی نے کوئی معاملہ پیش کیا۔ پیش کرنے والا اور ہے۔ ابتداً آپ کے دل میں اس کی طلب نہ تھی۔ جب اُس نے پیش کیا تو آپ نے قبول کرلیا۔ ایجاب ہوا، قبول ہوا۔ اب ایجاب وقبول کے بعد وفا واجب۔ لیکن یہ ایک رتبہ ہے وفا کا اِس میں قوت کتنی ہوگی؟ اس لئے کہ ابتدائی طلب تو اِدھر سے تھی نہیں۔ پیشکش تھی اُدھر سے۔ اب قبول کرلیا۔ (بڑے بوڑھے تو سمجھ رہے ہیں۔ جوانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا۔ تو میں کہوں) آج کل ایسا ہوتا ہے کہ پرانے لوگ بیچارے کیا شریف ہوتے تھے یا بیچارے ہوتے تھے، سادہ لوح، ماں باپ نے جہاں رشتہ کردیا، دل چاہ رہا ہے یا نہیں ہاں کہہ دی۔ نہ لڑکی کو دیکھا، نہ لڑکی نے لڑکے کو دیکھا، نہ گفتگو ہوئی نہ آواز سنی۔ کچھ بھی نہیں پرچھائیں تک بھی نہیں دیکھی تو طلب پیدا ہونے کا کیا سوال؟ ماں باپ نے کہا: یہاں کرلو۔ ایک پیشکش ہوئی۔ انہوں نے سر جھکا کر اطاعت میں کہہ دیا کہ جی قبول!

پیشکش کسی کی تھی قبول کرلیا مگر کیا عہدِ وفا نبھاتے تھے لوگ!

آج کل معاشرہ میں کتنی طلاقیں ہیں اور پہلے کتنی تھیں؟ census کیجئے، statistic کام میں لائیے، پہلے طلاقوں کا ratio زیادہ تھا یا اب زیادہ ہے؟..... پہلے پیشکش ہوئی، قبول کرلیا اور نبھا دیا اور اب دیکھ کر، سن کر، پرکھ کر قبول کیا اور پھر بھی نہیں نبھا پائے۔

اب ایک بات عرض کروں کبھی کبھی پیشکش قبول کرلینے میں نبھانا اچھا ہوتا ہے۔

خدا نے جسے پیش کیا اسے قبول کرلو۔ تم جسے انتخاب کرو گے ہوسکتا ہے اسے قتل کرنے کے درپے ہوجاؤ۔

خدا کی قسم ہم تو علیؑ کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔ خدا نے پیش کیا، مصطفیٰؐ نے پیش کیا ہم نے قبول کرلیا اور نبھا رہے ہیں۔ اللہ نے کہا مصطفیٰؐ سے پیش کردو علیؑ کی ولایت۔ مصطفیٰؐ نے پیش کی اور ہم نے قبول کرلی۔ غدیر کا دن اور آج کا دن!

رسولؐ نے کہا: ہمارے بعد بارہ ہیں۔ ہم نے تیرھویں کو تلاش ہی نہیں کیا۔ بارھواں پردۂ غیب میں ہے تو ہو..... جو آقا کی مرضی..... ہم تو وفا کرتے رہیں گے۔ ہم ان میں سے نہیں کہ آج انتخاب کیا اور کل قتل۔ آج انہیں منتخب کیا کل اُنہیں اتارا۔

بہر حال مثال دے رہا تھا کہ ایک مرتبۂ وفا وہ ہے کہ پیشکش کہیں سے ہوئی قبول کرلیا۔ وفا واجب۔ دوسرا مرتبہ وہ ہے کہ دونوں طرف سے آگ لگی ہوئی ہے۔

کیونکر رُکیں قدم کہ کشش جانبین ہو

اِدھر بھی طلب ہے، اُدھر بھی طلب ہے۔ اِدھر سے پیشکش ہے اُدھر سے قبول، اُدھر سے پیشکش ہے اِدھر سے قبول۔ یہ بھی برابر سے ہے عہد وفا لیکن جب ایجاب وقبول ہوجائے۔ وفا واجب ...... یہ اس سے برتر ہے۔ ہم نے بے عملی سے کم تر کردیا۔ یہ اس سے بہتر مرتبہ ہے۔

پہلے تو عذر تھا بھئی! مجھے طلب نہ تھی، میرے اوپر تو مسلط کردیا گیا، ہر شخص کی ہمدردی ہوگی۔ لیکن جب معلوم ہوجائے کہ طلب دونوں طرف سے تھی اب کہا جائے گا کہ نہیں یہ بے شرمی کی بات ہے، یہ بے حیائی کی بات ہے، یہ بے وفائی کی بات تھی۔ طلب دونوں طرف سے تھی اب نبھائیں۔ انسانیت کا شرف ہے وفا۔

تیسرا مرتبہ...... وہ ہے کہ طلب کرنے والے نے طلب نہیں کیا، ہم نے پیشکش کی اور جب پیشکش کی تو موقع تھا کہ بعد میں کہیں کہ پیشکش تو کردی تھی جذبات میں آکر مگر معاف کردیں ہم پورا نہیں کرسکتے تو یہ معافی بھی قبول ہوجائے گی۔ شریعت کے احکام،

نذر کے تمام احکام بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر سورۂ مائدہ سے پہنچئے سورہ دہر تک:
ویوفون بالنذر ٥ کچھ وہ ہیں جو نذر کی وفا کرتے ہیں۔

جو نذر مان لی، جو منت مان لی، اسے پورا کرنا ہے۔

اب گھر میں افطار کے لئے کچھ ہو یا نہ ہو۔ روزہ رکھنا ہے۔ عام حالات میں کیا ہے؟ نذر کے احکام .....کہ اگر اضطراری حالت میں نذر مانی ہے تو وہ نذر ہی نہیں ہے۔ اور اگر نذر مان لی، منعقد ہوگئی اور اُس موقع پر پتہ چلا کہ نہیں اضطرار نہیں تھا۔ بہت دقت کی۔ نہیں نذر تو منعقد ہوگئی۔ اب نذر پوری کرنے کے موقع پر حالات وہ باقی نہیں رہے یعنی معذور ہوگیا، مضطر ہوگیا، مضطرب ہوگیا، مجبور ہوگیا تو پروردگار نے حکم مرتفع کرلیا، وفا واجب نہیں ۔مگر یہ تو ہم جیسے عاجز بندوں کے لئے ہے۔ محمدؐ آلِ محمدؐ کے لئے نہیں ہے۔ وہ جو کہہ دیا: پروردگار ہم تیری راہ میں یہ اقدام کریں گے تو بس وفا کریں گے۔

پیغمبرؐ کے زمانے میں سورۂ دھر نازل ہوا اور حسنینؑ کا مسئلہ تھا۔ وہ بھی ایک وفا ہے۔ نذر کی وفا۔

یہ سب قران ، حدیث اور احکام کے حوالے آرہے ہیں درمیان میں۔ مگر یہ بتاؤ خدا کی قسم وفا کو اگر مجسم دیکھنا چاہو گے تو جو بھی تاریخ پر نظر رکھتا ہے اس کے ذہن میں ایک ہی نام آتا ہے عباسؑ!

میری طاقت ساتھ چھوڑ چکی مگر ابھی تو آپ کی آنکھوں نے آنسو برسانا شروع کئے ہیں۔ آج بخل نہ ہو، رونے میں۔ بس کل یہاں اس عزا خانے کی آخری مجلس ہے۔ محرم آیا اور رخصت ہوگیا۔ کیا انتظار تھا محرم کا۔ محرم آئے گا، رسول کو پرسہ دیں گے، محرم آئے گا ذکرِ مولا سنیں گے، محرم آئے گا ماتم کریں گے، محرم آئے گا آنسو بہائیں گے۔ محرم آیا اور جا رہا ہے۔

عباسؑ کا تذکرہ ہونا ہے۔ عباسؑ وہ کہ جس میں علمِ اخلاق مجسم ہوگیا، عباسؑ وہ کہ جس سے نامِ وفا وابستہ ہوگیا۔ عباسؑ پیکرِ وفا۔ حسینؑ نے وعدہ کیا تھا لیکن حسینؑ کے ساتھ

ساتھ وفا کرنے والوں میں عباسؑ بھی ہیں۔ کیسا باوفا ہے، کیسا شجاع ہے، کیسا جری ہے۔

وفا کی بحث ادھوری رہ جائے گی اگر ایک روایت نہ سنادوں۔ مولا علیؑ کے فضائل کے باب میں غالباً عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے اور دوسرے صحابہ سے بھی ہے۔ سب سے کہا کرتے تھے کہ علیؑ میں تین فضیلتیں ایسی تھیں کہ ان میں سے اگر ایک بھی مجھے مل جاتی تو بڑی سے بڑی دولت سے اہم تھی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ قران مجید میں ایک آیت ایسی ہے کہ جس پر سوائے علیؑ کے کوئی عمل نہ کرسکا۔ اور وہ ہے آیت نجویٰ۔

آیت نازل ہوئی کہ کہہ دیجئے اے حبیب کہ جو آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے صدقہ دیں۔ چاہے معمولی سا صدقہ ہو، ایک جَو صَدقہ کردیں، پہلے صدقہ دیں پھر آپ کے قریب آئیں۔ حضورؐ نے حکم الٰہی سنایا اور کوئی حضورؐ سے نجویٰ کے لئے نہ آیا۔ اب کس کس کی وفاداریاں زیرِ بحث لاؤں؟ حضورؐ سے شرفِ گفتگو کرنے کے لئے ایک جَو صَدقہ نہیں کرسکتے، ایک درہم صدقہ نہیں کرسکتے ...... جان کون دے گا؟

علیؑ کے پاس ایک دینار تھا، دینارِ سرخ اسے خورد کیا دس درہم ملے۔ ایک ایک درہم صَدقہ دیتے تھے سوال کرتے تھے۔

پہلا سوال کیا: یارسول اللہ ما الوفا؟..... وفا کیا ہے....

سنو یہ وفا کی تعریف کبھی ذہن میں نہ آئی ہوگی ......

حضورؐ نے کہا: الوفا ھو التوحید. وفا توحید ہے۔

میری تقریر کا پہلا جملہ اور یہ آخری جملہ مربوط ہوگیا۔

الوفا ھو التوحید. ھو الشھادۃ لا الہ الا اللہ۔

یہ وفا کی تعریف ذہن میں ہے۔ اب دیکھو پیکرِ وفا کی سیرت میں ایک چھوٹی سی روایت ملتی ہے۔ علیؑ نے عباسؑ کو بچپن میں زانو پر بٹھایا اور جیسے باپ تربیت کرتا ہے بچے کی۔ کہا: بیٹا کہو ایک۔

عباسؑ نے کہا: ایک۔

بیٹا اب کہو دو۔ خاموش ہو گئے۔ وفا کی بنیاد دیکھ لو۔

مولا نے مسکرا کر کہا: بیٹا کہو دو۔

واحد جب کہا کہہ دیا احد۔ اور جب کہا: اثنین۔

کہا: نہیں بابا جس زبان سے واحد کہہ دیا اب اثنین نہیں کہوں گا۔

یہ عباسؑ کا بچپنا۔ یہی عباسؑ ہے کہ جو میدان میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا حسینؑ کہہ رہے تھے کہ بھیا کہہ دو مجھے بھائی۔

کہا: جس زبان سے کہا آقا اب اس سے بھائی نہیں کہوں گا۔

عباسؑ کے نام سے یہ پرچم جڑا ہوا ہے۔ یہ پرچم، پرچم اسلام ہے۔ یہ پرچم، پرچم مصطفیٰؐ ہے۔ یہ پرچم وہی ہے جو بدر سے شروع ہوا اور کربلا تک پہنچا مگر عباسؑ کے ہاتھ میں آنے کے بعد اب قیامت تک یہ پرچمِ عباسؑ ہے۔ اس لئے کہ عباسؑ نے اس پرچم کے اٹھانے کا حق ادا کر دیا۔

سنو گے کہ کیسا حق ادا کیا ہے؟..... یہ میں روایت اکثر پڑھتا ہوں۔ مصائب کے واقعات تو پڑھ نہیں پاتا نا۔ یہ روایت اکثر پڑھتا ہوں۔ خدا کسی سربراہ مملکت کو یہ صدمہ نہ دکھائے، کسی بادشاہ کو، کسی امیر کو، کسی قائد کو، کسی رہبر کو یہ صدمہ نہ دکھائے۔ حسینؑ نے جو دیکھا۔ حسینؑ نے جو خراج پیش کیا ہے عباسؑ کی وفا کو وہ بے نظیر ہے اور آج تک ہماری جدید تہذیب میں جب کوئی سربراہ مملکت گزر جاتا ہے تو غم میں پرچم کو نیچا کر دیتے ہیں۔ ہے نا!.......

نیچا پرچم دیکھ کر نظر آتا ہے کہ مملکت کا کوئی بڑا فرد گزر گیا..... ہے نا! ...... یہی ہوتا ہے نا آج کل ساری دنیا میں؟ اور حسینؑ نے کیا کیا روزہ عاشورہ؟......

ایک علم سجایا اور اسے درِ خیمہ پر نصب کر دیا۔ اور دوسرا علم عباسؑ کو دیدیا اور جب روزِ عاشورہ ظہر کے بعد سپاہ حسینؑ ختم ہوگئی تو عباسؑ آئے: آقا اب مجھے بھی اجازت ہو.....

حسینؑ نے کہا: تم تو میری فوج کے سپہ سالار ہو۔

عباسؑ نے کہا: آقا فوج کہاں ہے؟

حسینؑ خاموش ہوئے۔ عباسؑ نے دوسری چیز پیش کی: آقا یہ دیکھ رہے ہیں؟ آقا نے دیکھا سکینہؑ کی سوکھی ہوئی مَشک۔ کہا اچھا اگر پانی کی سبیل کر سکتے ہو تو جاؤ۔

عباسؑ گئے۔ ایک ہاتھ میں علَم اور ایک میں مشک اور حسینؑ نے اپنے رہوار پر اپنی سواری کے گھوڑے پر قرار فرمایا اور وہ جو پرچم تھا درِ خیمہ پر اس پرچم کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔

حسین درِ خیمہ پر کھڑے ہیں پرچم کے سائے میں۔ عباسؑ دوسرا علم لے کر علقمہ کی طرف گئے۔ بیبیاں سب درِ خیمہ پر۔ بیبیوں کی نظریں حسینؑ کے چہرے پر۔

حسینؑ کی نظر عباسؑ کے علَم پر اور بار بار حسینؑ رکاب پر زور دے کر اٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ اور چہرے کا رنگ متغیر ہوتا تھا۔

بڑھ کر ایک بی بی نے پوچھا: آقا خیر تو ہے؟

کہا: جب عباسؑ کسی نشیبی جگہ میں جاتے ہیں، علم نظر نہیں آتا تو اٹھ کے دیکھتا ہوں۔ علم نظر آجاتا ہے تو دل کو قرار آجاتا ہے۔ یہی کیفیت تھی۔

ایک مرتبہ حسینؑ نے آواز سنی: آقا میرا آخری سلام۔

حسینؑ نے کمر پہ ہاتھ رکھا: الآن قد اِنْکَسَرَ ظهری. وقَلّت حیلتی۔

بس سنو گے؟ آج علم اٹھانا ہے آج حقِ وفا ادا کرنا ہے۔

حسینؑ نے ایک مرتبہ وہ علم سرنگوں کر دیا واعباسا! وامحمدا! واحسینا!

مجلس نہم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَاَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ

(سورہ روم آیت ۳۰)

برادران عزیز! قران کریم کی آیتوں کی رہنمائی میں کربلا شناسی کا سفر جاری ہے۔ آج اِس عزاخانہ کی آخری مجلس ہے۔ اس منبر سے میں نے فطرت شناسی اور دین شناسی کی بحث گزشتہ برس چھیڑی تھی اور خصوصیت کے ساتھ محرم اور ایام عزا سے متعلق گزشتہ برسوں میں مختلف تعبیریں آپ کے سامنے پیش کرتا رہا ہوں۔ ان تعبیروں کو فراموش نہ کیجئے گا۔ کبھی میں نے کہا کہ یہ مدرسۂ قران ہے کبھی میں نے گزارش کی پہلی محرم سے یہاں ایک سلسلۂ سیر وسلوک شروع ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑی تربیت گاہ ہے تزکیہ نفوس اور تطہیرِ شعور اور تکمیل عقل انسانی کے لئے۔ یہ سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔ یہاں عقل خام کار، عقلِ پختہ وتمام میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

ابھی آپ نصؔیر ترابی صاحب کے شعر میں حُر کا تذکرہ سن رہے تھے۔ شبِ عاشور

سے قبل وہ عقل خام کار کا نمائندہ تھا، صبح کو وہ عقل مجسم بنا ہوا تھا۔ یہ تزکیہ نفوس اور تکمیل عقول اور تطہیر شعور کی تربیت گاہ ہے۔ اور میں نے ایک جملہ اور عرض کیا تھا۔ اسے بھی یاد رکھیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ میں نے گزارش کی تھی۔ کہ ماہ مبارکِ رمضان تنزیلِ قران کا مہینہ ہے، محرم تاویل قران کا مہینہ ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی قران سے عشق و علاقہ رکھنے والا محرم سے بیگانہ رہے۔

جن فضاؤں کو ہمارا شاعر خراجِ عقیدت پیش کر رہا تھا، یہ وہی فضائیں ہیں جن میں پوری کائنات میں آیاتِ قرانیہ کی تلاوت ہو رہی ہے۔ مسلسل قرانی آیات کی تلاوت بھی ہو رہی ہے اور ان کی تفسیر بیان کی جا رہی ہے۔ ہم بھی فطرت شناسی اور دین شناسی کے باب میں اس سلسلہ بیانات میں، اس سلسلۂ تفکر اور سلسلۂ بحث و نظر میں دو اہم اُمور پر گفتگو کرتے رہے ہیں اور وہ فطرت کے دو عظیم اسرار ہیں۔ علم اور ارادہ......

علم اور ارادہ کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے میں نے یہ بھی گزارش کی کہ یہ امکانات روشن ہیں کہ ہم اِسی حوالے سے، اِسی refrence سے، اِسی تعلق سے، اِسی زاویے سے اِسی فکر کو محوری فکر قرار دے کر ایک پورا نظامِ فکر ترتیب دے لیں۔ ایک پورا نظامِ حیات فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ترتیب دے لیں۔ اس کا امکان بہت روشن ہے۔ کچھ کام ہوا ہے بہت کام کرنا باقی ہے۔

عِلم کے تعلق سے جو تعبیر حدیث نبویہؐ میں آئی ہے وہ تعبیر محض بر سبیلِ تمثیل نہیں ہے۔ وہ مجاز نہیں ہے، وہ استعارہٗ شاعرانہ نہیں ہے۔ وہ محض بر سبیل تشبیہ نہیں ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ حقیقتِ عِلم نوری ہے اور نورانی ہے اور جہاں جہاں علم آتا جاتا ہے وہاں وہاں خاک کی قلب ماہیت ہوتی چلی جاتی ہے۔

جہاں علم آیا تاریکی رخصت ہوئی۔ شخصیت نورانی ہو جاتی ہے۔ جب علم آنے کے ساتھ شخصیت نورانی ہو جاتی ہے تو جو علمِ لُدنّی لے کر آئیں ان کے نُوری ہونے میں کیا بحث ہو سکتی ہے۔

علم نور ہے، علم کی حقیقت نوری ہے، علم کی حقیقت نورانی ہے۔ یہ محض تمثیل و استعارہ نہیں ہے۔ حقیقتِ علم سے جہاں دامنِ خاک مَس ہوا وہیں نورانیت پیدا ہوئی۔

آ گئے سلمانؓ اہل بیتؑ میں
نور سے مَس ہوگئی کیا خاک بھی

جہاں نور سے خاک مَس ہوئی وہیں اس میں نورانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کُل حقیقتِ نور ہی کے تعلق سے میں نے گزارش کی کہ اگر علم اور علمیات کے تعلق سے گفتگو جاری رکھی جائے تو پھر علم کی تقسیمات کو بے معنی قرار دینا پڑے گا۔ اور علم کی قسمیں نہیں بلکہ علم کے مراتب کا تصور قائم کرنا ہوگا۔ علم ایک واحدِ بسیطِ مجرد حقیقت ہے لیکن ذو مراتب ہے، اس میں مراتب ہیں۔

جیسے نور کے مراتب ہیں، جیسے وجود کے مراتب ہیں۔ ایسے ہی عِلم کے مراتب واقسام نہیں ہیں۔ قسمیں نہیں ہیں۔ وہ بحث جو فلسفہ میں وجود سے متعلق ہوتی ہے کہ یہ وجودِ ممکن ہے، وہ وجودِ واجب ہے، یہ بھی انتزاعی بحثیں ہیں۔ ورنہ وجود وجود میں اس وقت تک آتا ہی نہیں ہے جب تک کہ وہ واجب نہ ہو جائے۔ معلوم ہے، علتِ تامہ ہوگی تو ممکن واجب بن جائے گا تو وجود ایک ہی ہے۔ وجود کی اس کی ذات کی حیثیت سے، حقیقت کے تعلق سے قسمیں نہیں ہیں، انتزاعی قسمیں ہیں۔ اس وقت آپ ہیں آپ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کا انکار نہیں کیا جا سکتا تو اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے جس کے سبب سے آپ ہیں!

اعتباری قسمیں ہیں، اعتباری سطحیں ہیں، اعتبارات ہیں۔ انتزاعی باتیں ہیں لیکن ذو مراتبِ حقیقتِ وجود، ذو مراتبِ حقیقتِ نور، ذو مراتبِ حقیقتِ علم، ذو مراتب ہیں ان کے مرتبے ہیں۔ دینوی معاملات سے متعلق علوم بے حد اہم ہیں لیکن ان کا مرتبہ بہر حال ایسا ہی ہے جیسا عقبیٰ کے مقابلہ میں دنیا کا مرتبہ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ زمین پر قدم رکھنا ناگزیر ہے۔ یہ جبرِ فطرت ہے۔ اور جب

زمین پر قدم رکھنا ناگزیر ہے تو پھر اربابِ مدارس کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ زمینی علوم کا حاصل کرنا بھی ناگزیر ہے، نہ آپ زمین سے قدم اٹھاسکتے ہیں نہ زمین سے متعلق علوم کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اسی طرح میں ارباب دانش سے کہتا ہوں کہ نہ آپ فضائے بسیط سے خارج ہوسکتے ہیں، آسمان کے سائے سے بے نیاز نہیں ہوسکتے تو آسمانی علوم سے بھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

عملی زندگی میں ایک بات معصوم نے فرمائی تھی۔ ایک سادہ لوح، بزعمِ خود مفکر اپنے وقت کا آگیا اور کہا: آقا، یابن رسول اللہ، فرزندِ رسول آپ امام اور حجتِ خدا ہیں مجھ سے گناہ چھوٹتا نہیں ہے۔ امام نے موعظہ فرمایا، نصیحتیں فرمائیں اور بالآخر اس منزل تک بات پہنچی کہ معصوم نے لہجہ بدل کر کہا: اچھا پروردگار کی بنائی ہوئی زمین اور اس کے آسمان کے حدود سے نکل جا اور پھر جو چاہے کر۔

نہ ہمارا فقیہ زمین سے بے نیاز ہوسکتا ہے، نہ ہمارا سائینسدان آسمان سے بے نیاز ہوسکتا ہے۔ اس لئے سب کو تمام علوم حاصل کرنا پڑیں گے۔ تقسیمات علوم سے کام نہیں چلے گا۔ ہاں ظاہر ہے Specialisation کے اپنے اپنے میدان ہیں۔ تشخص کے اپنے میدان ہیں وہ الگ بات ہے۔

یہ ایک پیغام ہے جو اس منبر سے دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہم رہبانیت پھیلا رہے ہیں، ہم دنیا سے بیزاری سکھلا رہے ہیں۔ نہیں ہم دنیا سے بیزاری نہیں سکھا رہے ہیں۔ مگر ہم مجبور ہیں اپنے آقا و مولا علی ابن ابی طالبؑ کے اس پیغام کو پہنچانے کے لئے۔ سنیئے !....

دنیا کو تین مرتبہ طلاقیں دی ہیں امامؑ نے۔ مشہور ہے۔ تین طلاقیں دیں۔ اور اس بارے میں جتنی روایتیں ہیں اور معجزات ہیں اور کرامات ہیں انہیں میں کیا عرض کروں۔ قابلِ تحمّل نہیں ہیں۔ کسی کو عقلی شبے ہوتے ہیں، کسی کو قلبی وسواس۔ حالانکہ نہ قلبی شبہوں کی

کوئی حیثیت ہے نہ قلبی وسواس کی۔ اگر ارادۂ انسانی صحیح و سالم ہے، اگر اولوالعزم بشر کا ارادہ مستحکم ہے تو نہ شبہوں کی کوئی گنجائش ہے، نہ شکوک کی ہے اور نہ وسواس کی ہے۔ بہر حال امیر المومنین علیہ السلام نے تین طلاقیں دیں اور دنیا کو کبھی توجہ سے دیکھا ہی نہیں۔

یاد رکھیئے گا طلاق کون دیتا ہے؟......... اب ہلکی ہلکی گفتگو کر رہا ہوں۔ آپ نے یہ حدیث سنی ہے۔ کتابوں میں موجود ہے۔ متفق بین الفریقین۔

میں متفق بین الفریقین ان حدیثوں کو کہتا ہوں جو علماء اسلام نے بلا اختلافِ مسلک نقل فرمائی ہیں۔ اور ان میں سے ہوسکتا ہے کہ کوئی کہے یہ قوی ہے، یہ ضعیف ہے۔ وہ کہتے ہیں اپنی جگہ۔ لیکن بہر حال جہاں تضعیف کرنے والے ہیں وہاں قبول کرنے والے بھی ہیں، وہاں تائید کرنے والے بھی ہیں۔ حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا و علیٌ ابوا ھذہ الامۃ۔ میں اور علیؑ اس امّت کے باپ ہیں۔

ایک ہی رتبہ میں رکھا ہے۔ نقل کرنے والوں نے سوچا نہیں کہ یہاں کہیں شرک بالنبّوت تو نہیں ہو رہا؟

میں اسی منبر سے گزارش کر چکا ہوں کہ شرک بالنبّوت انتہائی مہمل ترکیب ہے۔ کوئی معنی نہیں ہیں اس کے......... جو ختم نبوت کا منکر ہو یا شک رکھتا ہو یا شبہ رکھتا ہو وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے وہ توحیدِ خدا میں شک رکھتا ہو۔ اب جو جو کبھی نبوت کے باب میں شک کرے وہ اپنی توحید بھی درست کرتا چلا جائے۔

نبوتِ مصطفٰیؐ میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ مقامِ خاتمیت ہے مگر رسول کے نفس ہیں علیؑ......... مصطفٰیؐ کا نفس ہے مرتضٰیؑ۔

تعلق کیا ہے واللہ! اگر لفظی اور معنوی رعایتوں پر گفتگو ہو تو ایک الگ باب کھل جائے گا۔ مصطفٰیؐ جسے منتخب کیا گیا۔ مرتضٰی جس سے خدا راضی ہو جائے...... جسے منتخب کرے گا اسی سے تو راضی ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے ایک ہی نفس تھے۔

امیر المومنینؑ کو ایک رتبہ میں رکھا ہے۔ میں اور علیؑ اس امت کے باپ ہیں۔ اور اس کے بعد امیر المومنینؑ نے دنیا کو طلاق دی۔ نہج البلاغہ کا کلمہ پڑھنے والے ہمارے عزیز سامعین، نہج البلاغہ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں تو غور فرمائیں۔

دنیا کی مذمت میں نہج البلاغہ میں بہت فرمودات ہیں مگر اس مقام پر عجیب وغریب بیان ہے۔ اس قدر فکر انگیز، اس قدر خیال انگیز، اس قدر حیات پرور ہیں۔ کسی نے کسی کی شکایت کی کہ آقا یہ دنیا کی طرف زیادہ راغب ہیں، مائل ہیں۔

آقا نے مسکرا کے فرمایا: الدنیا کامة الرجل (الناس ابنآء الدنیا) ارے دنیا کی حیثیت ایک مرد کے لئے، ایک انسان کے لئے ایک ماں کی سی ہے۔

ولا یلام الرجل علیٰ حب امه

اگر کوئی اپنی ماں سے محبت کرے تو اسے ملامت نہیں کی جاتی۔

دنیا کی نسبت ایک عام انسان سے ماں کی سی ہے اپنا جیسا کیسے کہیں گے جب اس کو طلاق دے رہے ہیں۔ آپ اور وہ ایک مرتبہ پر کیسے آجائیں گے؟......... وہ طلاق دے رہے ہیں۔

فرمایا کہ یہ دنیا ایک عام انسان کے لئے ماں کی سی منزلت رکھتی ہے۔

ولا یلام الرجل علیٰ حبِ امه اور اگر کوئی اپنی ماں سے محبت کرے تو اس کی ملامت نہیں کی جاتی۔

اس میں ایک سبب کیا پوشیدہ ہے؟........ ماں سببِ وجود ہوتی ہے۔ ماں سببِ تربیت ہوتی ہے، ماں سببِ بقا ہوتی ہے، ماں سر پرستی کرتی ہے۔ شیر مادر نوش جان کر کے آدمی تربیت پاتا ہے اور بڑھتا ہے، سب کچھ ہے لیکن ماں کے تقدس کا خیال کیجئے۔ ماں کے تمام تر ایسے کاموں کے باوجود ماں کی طرف کیسے نظر اٹھاتے ہیں؟ بس دنیا کی طرف ایسی ہی پاکیزہ نظر اٹھے، ہوس کارانہ نگاہ نہ اٹھے۔

ماں کے تقدس کا خیال کیجئے۔ پروردگار نے جو شے پیدا کی ہے وہ خیر ہے۔ جو بھی

چیز پیدا کی، اس میں کوئی نہ کوئی ایک سطح تقدس کی پائی جاتی ہے۔ دنیا کے تقدس کو پامال نہ کریں کہ بڑا گناہ یہی ہے۔

آج آخری مجلس ہے تو تھوڑا سا مواعظہ بھی کرتا چلوں۔ انسانی رشتوں کی حقیقتوں کو پہچانیں۔ لوگ عجب عجب انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سب سے مقدس رشتہ ماں کا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ بھی نہیں۔ مگر میں جوانوں سے ایک سوال کروں کہ روئے زمین پر قائم ہونے والا سب سے پہلا رشتہ کون سا ہے؟.........

آدمؑ و حواؑ کے درمیان۔ زوجیت کا رشتہ ہے۔ جب یہ رشتہ قائم ہوا اور نسلِ انسانی آگے بڑھی تب ماں اور اولاد کا رشتہ قائم ہوا۔ تب بھائی اور بہن کا رشتہ قائم ہوا۔ نخلی جتنے رشتے ہیں وہ اس رشتہ کی فرع ہیں۔ اصل ہے یہ رشتہ ٔ زوجیت۔ یہ بتائیے کہ کسی غیر مقدس رشتہ سے کیا مقدس شے وجود میں آسکتی ہے؟ زندگی کے تقدس کو پہچانیں۔ دنیا کے تقدس اور طہارت کا خیال رکھیں۔ جتنا دنیا کی طہارت کا خیال ہوگا، جتنا انسانی رشتوں کی طہارت اور تقدس کا خیال ہوگا اتنا ہی تمہارا نفس پاکیزہ ہوگا۔ اتنا ہی تمہارا وجود مقدس ہوگا۔

تو عرض کر رہا تھا کہ نہ دنیا کو آپ نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ عقبیٰ کو۔ نہ دینی علوم کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ اُخروی علوم کو۔ کل مراتب علوم کی گفتگو تقریباً اشارتاً تمام ہو چکی اب دوسرا جز تھا ارادہ کا۔ علم کے حوالے سے مراتبِ علم کو پہچانیں اور ارادہ کے حوالے سے وجودی حقیقتوں کو سمجھیں۔ آج ارادہ کے تعلق سے مراتب وجود کو سمجھیں۔ نظام کائنات کو سمجھیں۔ اشارتاً اور ضمناً یہ گفتگو آچکی ہے۔ لیکن آج آخری گفتگو ہے توجہ سے غور فرمالیں۔

اس آیت کریمہ میں مسلسل ایک بحث چلی آرہی ہے جو سائنس سے بھی مربوط ہے، فلسفہ سے بھی مربوط ہے، دین سے بھی مربوط ہے، جسے میں چھیڑ نہیں رہا ہوں۔ کیا ہے؟

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق اللهo بس اپنا رخ حیات، اپنا چہرہ، اپنی زندگی دین کی طرف کرلو۔ بغیر کسی انحراف کے۔ فطرت الله التی فطر الناس علیهاo یہ اللہ کی وہ فطرت ہے کہ جس پر اس نے انسانی طبیعتوں کو ڈھالا ہے۔

لا تبدیل لخلق اللهo خلق خدا میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

یہ ''خلق خدا میں تبدیلی نہیں ہوتی'' ترجمہ تو کیا گیا لیکن اس بحث کو چھیڑا نہیں گیا۔ تبدیلی سے ذہن فوراً (اس طرف) جاتا ہے کہ سائنس نے کچھ Constants کا تصور بھی دیا ہے، کچھ absolute realities کا تصور دیا ہے، کچھ universal laws کا تصور دیا ہے۔ universal laws وہ ہیں کہ جو قابل تغیر نہیں ہیں یعنی کچھ ثابت اصول اور بنیادیں اس کائنات کی ہیں۔ قران کہہ رہا ہے: **لا تبدیل لخلق اللهo**

خلق خدا میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تو عام ذہن فوراً یہ سوچتا ہے کہ یہ دائمی اصول universal laws جو ہیں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی طرف اشارہ نہیں ہوگا۔ لیکن صرف اسی کی طرف اشارہ ہے یہ تفسیر بالرائے ہوجائے گی۔ یہ نہیں منحصر کرسکتے کہ صرف اسی کی طرف اشارہ ہو۔ اور دوسری طرف ثابت اور متغیر کی بحث سائنس اور فلسفہ میں بڑی عجیب ہے اور دین میں بھی ہے۔ دین میں یہ فطری چیزیں ثابت ہیں۔

اتنی چیزیں متغیر ہیں اور انہیں قرار نہیں ہے ثبات نہیں ہے۔ واضح ہے نا!

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں۔

مگر بڑی سلامتی سے یہ شاعر زمانہ کا لفظ استعمال کرکے گزر گیا۔

بحثیں علمی ہیں، تقریر آخری ہے اس لئے میں صرف اشارات کرکے گفتگو کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ ثابت حقیقتوں کا انکار ممکن نہیں ہے۔ متغیرات کو ہم دیکھتے ہیں اس کے باوجود کہنے والا کہتا ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

گویا تغیر خود ایک ثابت اصول ہے۔ عجب تفاوت ہے اس مصرعہ میں اور اس مضمون میں۔ اور حقیقت پر بنی ہے یہ مضمون مطلق! شاعر نے نظریۂ حرکتِ جوہریہ پیش کیا کہ ہر چیز میں مسلسل حرکت موجود ہے۔ جہاں سکون آیا وہاں وجود عدم سے بدل جائے گا۔

کائنات حرکت کی جلوہ گری ہے۔ یہ جامد چیزیں پتھر اور لوہا اس میں بھی کہتے ہیں کہ اس کا دل مسلسل دھڑک رہا ہے۔ Electrons کی گردش مسلسل ہو رہی ہے۔ اگر ایٹم کے اندر اپنے orbits پر electrons کی گردش میں ذرا بھی خلل واقع ہو جائے تو قیامت برپا ہو جائے۔ ہم نے کتنی ہی سریع السیر چیزیں بنا ڈالیں، کہیں نہ کہیں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور اتنے زمانے سے کائنات باقی ہے کہ اس میں خلل واقع نہیں ہو رہا ہے۔ یہ دیکھئے کہ ہماری بنائی ہوئی چیز میں ثبات ہے یا اس کے بنائے ہوئے تغیر میں ثبات۔

حکمت و تدبر الٰہی کو سمجھیں۔ یہ ہے کیا چیز؟ ثبات و تغیر کا سارا فلسفہ سمجھ میں آجائے گا ارادہ کی بحث میں۔

دنیا میں کچھ قوتیں ہیں جو ثبات ہیں۔ کچھ قوتیں ہیں جن کا دائرہ وسیع تر ہے، کچھ قوتیں ہیں جن کا دائرہ محدود تر ہے۔ کچھ قوتیں stone ہیں کچھ piece ہیں کچھ universal ہیں کچھ کا دائرہ محدود ہے۔ ایک منزل تک، ایک شاخ، آپ کے ارادے کی بحث سے مربوط ہے۔

جس طرح آپ کے ارادے کے مراتب ہیں جو آپ کی زندگی کو منظّم کرتے ہیں، آپ کی گھریلو زندگی کو منظّم کرتے ہیں اسی طرح کوئی ایک ذات ہے۔ قوتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے سوائے یہ کہ اس کے ارادے ہیں جس شے کے متعلق ہو جائیں۔

ارادۂ الٰہی ہے جس شے سے متعلق ہو جائے فنفخت فیه من روحی اور ہم آدم کے پیکر میں روح پھونک دیتے ہیں۔ پروردگار کے پاس کوئی حنجرہ ہے؟ پھیپھڑے ہیں؟

سانس لیتا ہے وہ؟ پھونکے گا کوئی ہوا؟.........صور پھونکے گا؟.........

سبحان اللہ فلسفۂ روح! اللہ نہ ہوا بلکہ اللہ بندہ ہوگیا!!

انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون (سورۂ یٰسین آیت ۸۲)

یہ سب اس کے ارادے کی کرشمہ سازی ہے۔ اس نے چاہا کہ یہ پیکر متحرک ہوجائے بس حرکت آ گئی۔

جس شے سے جس طرح ارادے کا تعلق قائم ہوجائے وہ شے ویسے ہی رہے گی۔ اچھا یہ بات سمجھ میں کیسے آئے گی؟.........جس طرح سے کہ پیکر انسانی میں روح ہے اسی طریقہ سے اس پوری کائنات میں مشیت و ارادۂ الٰہی کا تعلق قائم ہے۔

اگر آپ آنکھوں کو کھولنا چاہیں کھلی رہیں گی۔ دونوں انگلیوں سے پلکوں کو سنبھالنا تو نہ پڑے گا۔ فرض کیجئے آپ رات بھر کے جاگے ہیں تھکے ہوئے ہوتے ہیں، کئی دنوں کے جاگے ہوئے ہیں۔ ماشاللہ آپ شب بیداریاں کررہے ہیں۔ خدا ان آنکھوں کو ہمیشہ نور کا سرچشمہ بنائے رکھے۔ یہ جو محرم میں شب بیداریاں کرتی ہیں، ذکر خدا میں ان ایام اللہ کے سلسلے میں۔ یہ آنکھیں تھکی جاتی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں لگتی جارہی ہیں مگر لگتی وگتی نہیں ہیں اگر ارادہ کامل تر ہے تو پلکوں کو پکڑنا نہیں پڑے گا۔ اگر ارادہ ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں، پلکوں کی مجال نہیں ہے کہ بند ہوجائیں۔ یہ ارادۂ الٰہیہ جب تک ہے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ قائم رہے۔ مجال نہیں کہ زمین و آسمان متصل ہوجائیں۔

اگر آپ ارادہ کرلیں کہ کسی شے کو گوشۂ چشم سے دیکھنا ہے یا بھرپور نظر اس پر ڈالنی ہے تو کیا آپ کو آنکھوں کا زاویہ ہاتھوں سے بنانا پڑے گا؟ جیسے جیسے نفس کا ارادہ بدلے گا، آنکھوں کا زاویہ بدلتا چلا جائے گا۔ اسی طرح ارادہ الٰہیہ ہے وہ جسے چاہے گا بھرپور نظر سے سرفراز کرے گا۔

یہ جو ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ یہ آسمان بغیر کسی ستون کے قائم ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں دیکھتے نہیں ہو تمہاری پلکیں کھلی ہوئی ہیں بغیر انگلیوں کو لگائے ہوئے۔ ارادہ

ہے نا! اس کا ارادہ ہے تو کائنات قائم۔ اس کا ارادہ جس شے سے، جس طرح، جس سطح پر ملتفت ہوگا، متعلق ہوگا وہ شے اسی طرح وجود پائے گی۔

میں نے بحث بھی کی تھی کہ ہمارے ارادے کے دو سرے ہیں ایک سرے کا تعلق علم سے کہ نظر نہیں آتا ایک سرے کا تعلق ہمارے فعل سے ہے وہی نظر آتا ہے فعل کی شکل میں۔ تو پروردگار عالم کا وہ ارادہ تو ہمیں نظر ہی نہیں آسکتا کہ کس شے سے کیسے متعلق ہوتا ہے، کب متعلق ہوتا ہے اور کب تعلق ختم ہوتا ہے اور کیسے فوراً؟

کن فیکون کا جلوہ نظر نہ آتا اگر ہم نے ایسے اولوالعزم مشیتِ الٰہی کے پیکر نہ دیکھے ہوتے کہ جوان کو لاکر لٹادو۔ ارادہ کرکے تکبیر کہیں گے تو مرجائے گا۔

ارے مولا نے کیا کیا تھا؟........ کوئی تلوار اٹھائی تھی؟ قدم مبارک رکھ دیا تھا؟...... کیا کیا تھا؟........ لائے تھے اس پر استہزاء کرنے کے لئے........

کس سے تمسخر کا ارادہ تھا؟.......... کس کا مذاق اڑانا چاہتے تھے نعوذ باللہ؟ علیؑ کا؟........ مرتضیٰؑ کا؟......... جو شب ہجرت اللہ کی مرضیاں خرید چکا!

مرتضیٰؑ اور مصطفیٰؐ کے اگر مراتب کا فرق دیکھنا ہو تو دیکھو........ مصطفیٰؐ اس عظیم انسان کا نام ہے جس کے بستر پر اگر ایک شخص سوجائے تو علیؑ مالکِ مرضیِ خدا ہوجاتا ہے۔

کیا ہے ملتِ مسلمہ کو ابھی معرفتِ مصطفیٰؐ؟ مصطفیٰؐ کے کلمہ گو جانتے نہیں ہیں کہ مصطفیٰؐ کیا ہیں۔ اور مصطفیٰؐ کی معرفت حاصل کرنی ہو تو مرتضیٰؑ کو دیکھیں جو یہ کہنے والا ہو کہ میں مصطفیٰؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔ جو ایک شب خود کو مصطفیٰؐ کے بستر پر سلادے، اپنے ارادے سے۔ جبراً نہیں، اپنے ارادے سے، اپنی مرضی سے۔ اسی نے کہا: یارسول اللہ میں اگر سوگیا بستر پر تو آپ محفوظ رہیں گے؟

یہ عقل کا سوال ہے یا عشق کا؟........ علیؑ کا جملہ ہے کسی اور کا نہیں........ عقل کا بھی یہی جواب ہے اور عشق کا بھی....... ہم تو مکتب توحید کے فرزند ہیں۔ ہم عقل اور عشق میں دوئی اور ثنویت نہیں دیکھتے۔ ہم توحید وجودی پہ قائم ہیں ہم ثنویت کا علم نہیں

برداشت کرتے۔ عقل و عشق میں جھگڑا دیکھنے والے نہ کسی عقل کے مرتبے پر فائز ہیں نہ عشق سے آشنا۔

ارے علم اور ارادے کی بحث کو یہاں تک لے کر اسی لئے آیا کہ علم بمنزلۂ عقل ہے۔ عقل بمنزلہ علم، علم عقل کا دوسرا نام، عقل علم کا دوسرا نام۔ عشق ارادے کا دوسرا نام، ارادہ عشق کا دوسرا نام، علم اور ارادہ جدا نہیں ہوسکتا۔ عقل اور عشق بھی جدا نہیں ہوسکتے۔

علم اور ارادہ کے تعلق کو سمجھیں پھر عقل اور عشق کا رشتہ سمجھ میں آئے گا۔ یہ فلسفہ کی بنیادی بحثیں ہیں۔

علیؑ نے کہا: اگر میں سو جاؤں تو آپ کی زندگی بچ جائے گی؟

یہ عقلِ علیؑ کا بھی سوال ہے اور عشقِ علیؑ کا بھی سوال ہے اور اصلاً سوال نہیں ہے۔ اسی کو کہتے ہیں استفہام انسانی۔ پوچھ نہیں رہے ہیں معلوم ہے۔ نفس کو نفس کا حال معلوم نہ ہوگا تو کسے ہوگا؟

ارے غیروں کو بتانے کے لئے......... طولِ تاریخ میں جملہ محفوظ ہوجائے اس لئے سوالات ہوتے ہیں۔ ورنہ علیؑ کو سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ علیؑ کہ جب پیغمبرؐ معراج سے واپس آئے اور علیؑ نے کہا: آپ بتائیں گے یا میں بتاؤں؟ وہ اس لئے پوچھ رہے ہیں تاکہ طولِ تاریخ میں جملہ محفوظ ہوجائے۔ سوال بھی محفوظ رہے، جواب بھی محفوظ رہے۔

علیؑ نے یہ نہیں پوچھا میرا کیا ہوگا۔ اگر عقل تاجرانہ ہوتی، اگر عقلِ کامگار ہوتی۔ تو تردّد ہوتا، یا سوال دراز ہوتا۔ آپ کا کیا ہوگا میرا کیا ہوگا؟ اور عقل عیار ہوتی تو مشورہ دیتی کہ آپ سوئیں میں پہرہ دیتا ہوں۔ نبّوت کو عقل عیار مشورے دیا کرتی ہے۔ عقلِ کامل نبّوت سے استفسار کرکے اطمینان کرتی ہے اور ایک استفسار میں سینۂ تاریخ کے اضطراب کو مٹادیتی ہے۔ ورنہ مشورہ دیا جاسکتا تھا: یا رسول اللہؐ گھر کو چاروں طرف سے گھیرا جاچکا ہے۔ منصوبہ بن چکا ہے۔ تلواریں نکلی ہوئی ہیں۔ دشمن جمع ہورہے ہیں۔ کچھ راستے میں

بھی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی گزند پہنچ جائے۔ گزند تو اس وقت بھی پہنچتی مگر فوری نہیں پہنچتی تو مشورہ دیا جاسکتا تھا کہ یارسول اللہؐ آپ باہر نہ تشریف لے جائیں گھر ہی میں رہیں میں باہر تلوار لے کر پہرہ دیتا ہوں.......... علیؑ ہیں۔ جانتے ہیں کہ نبوت کو مشوروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مصطفےٰؐ اور مرتضیٰؑ کا رشتہ سنیں۔ نفسیت، منّیت وہ سب اپنی جگہ ایک نفس ہیں یہ اپنی جگہ اگر اعتباری ظواہر کو نظر میں لائیں تو جو رشتہ علم اور ارادہ میں ہے، جو رشتہ عقل اور عشق میں ہے وہی رشتہ مصطفےٰؐ اور مرتضیٰؑ میں ہے۔

مصطفےٰؐ علم...... علیؑ ارادہ ...... مصطفےٰؐ عقل..... علیؑ عشق۔

علم کی بحث میں عقل نے اپنے آپ کو مٹادیا ہے۔

آج ارادے کی بحث کو سمجھ کر کائنات کی مادی قوتوں کا وہم دل سے نکال دیں ....بس ارادۂ الٰہی ہے۔ جس شے سے جیسے متعلق ہوجائے۔ البتہ اس کا ارادہ اس شے سے اتنا ہی ہوتا ہے جتنی اس شے کی استعداد ہو۔ حدیثیں بنالینے سے بات نہیں بنتی۔ کہ نبوت جاری رہتی تو فلاں تک پہنچتی اور فلاں تک پہنچتی۔ جو نبی ہوسکتا ہے اس کو خدا نبی بنادیتا۔ جو ولی ہوسکتا ہے اسی کو خدا ولی بنادیتا ہم اپنی کوششوں سے ولی نہیں بن سکتے، ہم اپنی کوششوں سے نبی نہیں بن سکتے۔ سمندر اپنی کوشش سے پہاڑ نہیں بن سکتا۔ پہاڑ اپنی کوشش سے سمندر نہیں بن سکتا۔ جس چیز میں جیسی استعداد ہوگی، دامنِ ربط جیسا ہوگا عطا ویسی ہی ہوگی، ارادہ ویسے ہی متعلق ہوگا۔

ارادۂ الٰہی ہے جو کائنات کو چلارہا ہے۔ اور جو حاصلِ ارادۂ الٰہی ہوتا ہے وہ صاحبِ معجزات ہوتا ہے....... معجزات سمجھ میں نہیں آتے۔ معجزات ارادۂ الوالعزم کے مظہر ہیں۔ مردے کو زندہ کردینا، زندہ کو مردہ کردینا....... یہ کیا ہے؟ ....

میں ارادہ کروں کہ خاموش ہوجاؤں....... خاموش ہوجاؤں گا۔ میں ارادہ کروں کہ بولوں۔ بولوں گا۔ یہ تو سب کو آتا ہے لیکن میں ارادہ کروں کہ آپ نہ بولیں! آسان

نہیں ہے مگر ممکن ہے۔ بس ارادہ سے تعلق ہے۔

ہمارا ارادہ ضعیف ہے، اور ایسا ہے کہ کبھی کبھی ہمارا ارادہ ہمارے جسم میں بھی کام نہیں کرتا، ایسا ہوتا ہے ارادہ کمزور پڑجاتا ہے اور بالآخر آنکھیں بند ہوجاتی ہیں...... ہوتا ہے یعنی ایک منزل ہوتی ہے جب ارادہ کمزور پڑجاتا ہے اور جب تک ارادہ کی قوت رہے گی اس وقت تک اس کا اظہار ہوگا۔ جہاں ارادہ کمزور ہوا تو آنکھیں بند ہوئیں۔

ابھی جسم صحیح و سالم ہے ارادہ کرتے ہیں لیٹ جاتے ہیں اور ارادہ کرتے ہیں جاگ جاتے ہیں۔ یہ ارادہ دراصل روح کا ہے نا! میرا ارادہ ہے...... ''میں'' تو میری روح ہے۔ اسی لئے عرفانِ عملی کے باب میں، ریاضتوں کے نتیجے میں، اذکار کے نتیجے میں، مسائل کے نتیجے میں، قران مجید کی تلاوت کے نتیجے میں اور عشقِ محمدؐ و آلِ محمدؑ کے نتیجے میں ایک منزل وہ آتی ہے کہ جب عرفاء کہتے ہیں کہ موت اختیاری ہوجاتی ہے۔

موت اختیاری ایسے ہی ہے کہ میں چاہوں تو بولوں، چاہوں تو نہ بولوں۔ میں چاہوں تو آنکھیں کھولوں، نہ چاہوں تو نہ کھولوں۔ چاہوں تو زندگی کے آثار میرے جسم سے متعلق رہیں اور چاہوں تو میں اپنی روح کا کوئی کام بدن سے نہ لوں۔ مگر یہ چاہت، طلب، ارادہ (ہے)۔

(برادرِ محترم، حجت الاسلام، مولانا افتخار صاحب تشریف فرما ہیں۔ یہ کراچی میں آپ کے وطنِ عزیز میں ہیں ان سے استفادہ کیجئے گا۔ میں تو مسافر ہوں چلا جاؤں گا۔ جوان ان سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ ذمہ دار عالم ہیں، میرے عزیز ہیں اور حوزہ کی اصطلاح میں قرۃ العین ہیں)۔

حوزہ میں طویل ترین بحث طلب اور ارادہ کی ہے اور صاحب کفایہ کا وہ جملہ آپ کے سامنے پڑھ چکا ہوں آج پھر ان کے سامنے پڑھ رہا ہوں۔ قلم این جارسید وسر بشکست۔ قلم یہاں تک پہنچا اور پھر اس نے اپنا سر پھوڑ لیا۔

طلب و ارادہ کی بحث ہے۔ جبر اور اختیار کی بحث ہے لیکن یہ دیکھیں کہ عرفاء نے

موت کو بھی اختیاری بنالیا۔ کیسے بنالیا؟........ یہ تبھی ممکن ہے جب اُن کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ واقعہ ذہن میں رکھیں بیان کر چکا ہوں۔ پوچھیں گے: پڑھ دوں جنازہ؟

ارے مجھ سے نمازِ جنازہ پڑھانے کو کہہ رہے ہو۔ پڑھ دوں؟........ کس لہجے سے کہا ہوگا؟........ اور پھر پڑھی تکبیر...... نماز پڑھا رہے تھے۔ وہ مذاق کر رہے تھے۔ علیؑ تو مذاق نہیں کر رہے تھے۔

نماز یا کوئی بھی عمل بغیر نیت کے نہیں ہوتا۔ نیت یعنی ارادہ۔ جب امامؑ نے کہا کہ میں نیت کر رہا ہوں نماز جنازہ کی، امامؑ کا ارادہ جنازہ کے متعلق ہو تو وہ زندہ رہ کیسے سکتا ہے؟

جو زندہ کو لے گئے تھے مردہ کو لے کر واپس آئے۔ جو خوش خوش گئے تھے علیؑ کا استہزا کرنے وہ روتے ہوئے آئے۔ علیؑ نے زندگی واپس کر دی۔ ارادہ ہی تو تھا!

کتنے معجزات ہیں!........ درِ خیبر اکھاڑا۔ لوگ پوچھنے آئے:

یا علیؑ آپ تو جَو کی سوکھی روٹیاں گھٹنوں سے توڑتے ہیں یہ کیسے ہو گیا؟

فرمایا: ما بقوتِ بدنیه بل بقوتِ یزدانیه o میں نے جسم کی قوت سے بابِ خیبر کو نہیں اکھاڑا ہے بلکہ میں نے قوتِ ارادی ربّانیہ سے درِ خیبر کو اکھاڑا ہے........

یہ ارادۂ الٰہی ہے۔ پتھر کو جس طرح چاہیں زبان عطا کر دیں۔ درخت کو جس طرح چاہیں، قدم آگاہ کر دیں، انسان کو جس طرح چاہیں زندگی کا افتخار بخش دیں۔

یہ سب ارادہ الٰہیہ کی جلوہ فرمائی ہے۔

اس کائنات میں ارادۂ الٰہی جاری و ساری ہے۔ اور جب ارادۂ معصوم سے نفوس پر تسلط کرتا ہے تو شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

ارادہ اگر قوی ہو تو کوئی وسواس قریب نہیں آتا۔ کربلا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔

ایک ارادۂ معصوم نے بہتّر ۷۲ "محفوظ عن الخطاء" پیدا کر دیئے۔

آج اس عزا خانے کی آخری مجلس ہے۔ عزیزو! شہادتیں تو سب کی روزِ عاشور ہوئی ہیں لیکن ہم تعزیت پیش کرنے کے لئے دنوں کو مخصوص کر لیتے ہیں۔ حُرؑ کو رو چکے،

اکبرؑ کو رو چکے، اصغرؑ کا ماتم کر چکے، عباسؑ کا ماتم کر چکے، یہاں کی رسم کے مطابق چھ محرم کو خالی جھولا اٹھایا گیا تھا۔ کل علم نکالا تھا، ماتم کر رہے تھے۔ وہ علم جسے سید الشہداء علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار، اپنے بھائی، اپنے وفادار، عباسؑ کے اعزاز میں سرنگوں کر دیا تھا۔ عباسؑ کا لاشہ نہیں آیا تھا بلکہ وہی خون میں غلطاں علم لاشہ کی شبیہ میں لے کر آئے تھے۔ اور جب بیبیاں، عباسؑ کو، اکبرؑ کو رو چکیں تو حسینؑ بیبیوں سے رخصتِ آخر کے لئے آئے۔ حسینؑ درِ خیمہ پر کھڑے تھے۔

اب چشمِ تصور وا کر لیں۔ دیکھیں کربلا میں دس محرم کو ۶۱ھ میں، عصر کے ہنگام حسینؑ درِ خیمہ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب روایت ہے۔ اس روایت کا تصور ذہن سے مِٹتا نہیں ہے۔ علامہ واحد افغانی نے روایت بیان کی ہے اور مستقلاً یہ حقیر نقل کر رہا ہے۔ یہ روایت بی بی امِ کلثومؑ سے ہے۔ بی بی زینبؑ سے یہ روایت نہیں ہے۔ اس روایت کو غور سے سنیں۔ آقا آئے ہیں رخصت آخر کے لئے۔ ایک مرتبہ بی بی کہتی ہیں کہ آقا آئے لیکن پہلے ہمارے خیمے میں آئے، ہم سب سے خدا حافظی کی۔ ایک ایک بی بی سے، بچوں سے، جناب سیدِ سجادؑ کے سرہانے پہنچے۔ سیدِ سجادؑ کو غشی سے افاقہ ہوا اور ایک مرتبہ جنابِ سیدِ سجادؑ نے پھوپھی اماں سے کہا: پھوپھی اماں یہ میرے سرہانے کون ہے؟

سر سے پیر تک حسینؑ لہو سے نہائے ہوئے ہیں۔ جسم پر تیر پیوست ہیں۔

بیٹے نے بیماری کی کیفیت میں پوچھا: پھوپھی اماں کون بیٹھا ہوا ہے؟

پھوپھی نے کہا: بیٹا بابا ہیں بابا۔

کیا نالۂ فریاد کی کیفیت ہوگی۔ کس میں طاقت ہے کہ وہ زبان حال بھی بیان کر سکے۔ ''بابا! اکبرؑ کہاں ہیں؟ .... بابا! عباسؑ کہاں ہیں؟ بابا! قاسمؑ کہاں ہیں؟

ہر سوال کا جواب تھا۔ قَد قُتِلَ...... آخر میں کہا: بس بیٹا اب مَردوں میں صرف تم ہو یا میں۔ اسرارِ امامت تلقین فرمائے۔ رخصت ہوئے، خیمے سے نکلے۔ (اب جو بی بی امِ کلثومؑ کی روایت ہے وہ یہاں سے آغاز ہوتی ہے) کہ میں نے دیکھا کہ اس خیمے کی

طرف گئے جہاں رات بھر اصحاب کا مجمع تھا۔ میرا جی چاہا میں جا کر دامن تھام لوں: بھیا وہ خیمہ خالی ہو گیا۔

آقا نے خیمہ کا پردہ اٹھایا اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد بلند آواز سے گریہ کیا۔ پھر وہیں سے رخ کیا اس خیمہ کا جہاں ذبح کئے ہوئے لاشے تھے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھ رہے تھے جیسے کوہِ وقار چل رہا ہو۔ اس خیمے تک گئے، پردہ اٹھایا اور ایک ایک لاشے کو غور سے دیکھا اور فرمایا: میرے شیرو! تم نے حقِ وفا ادا کر دیا۔ اب میں جا رہا ہوں کاش تم میری جنگ دیکھتے۔

حسینؑ کا گھوڑا سر جھکائے کھڑا تھا۔ حسینؑ آئے اور ایک مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھا۔ بی بی ام کلثومؑ کہتی ہیں: میں سمجھ گئی میں سوار کراؤں گی۔

حسینؑ سوار ہوئے۔ بی بی ام کلثومؑ کہتی ہیں: بھیا کا گھوڑا آگے بڑھا، میری آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا، میں نے دیکھا کوئی بزرگ ہے جس کے سر پر عمامہ نہیں ہے۔ بال سفید، ریش مبارک سفید۔ اور ایک اور شخصیت ہے دونوں گھوڑے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ میں نے بہن زینبؑ سے کہا: بہن دیکھتی ہو؟........

کہا! کیا؟........

کہا: بھیا کے پیچھے کوئی دوڑ رہا ہے۔ میں بھی دوڑی۔

حسینؑ رُکے کہا: ام کلثوم واپس جاؤ۔

میں نے کہا: بھیا! یہ بتاؤ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟

کہا: بہن جیسے میں نے اکبرؑ کو رخصت کیا تھا۔ رسول اللہؐ اسی طرح مجھے رخصت کر رہے ہیں۔

علامہ طالب جوہری مدظلہ کی تقاریر کے مجموعے

انسان، معاصر اور قرآن

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۷ء

تہذیبِ نفس اور تہذیبِ حاضر

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۱۹ھ بمطابق ۱۹۹۸ء

عالمی معاشرہ اور قرآنِ حکیم

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۹۹۹ء

حیات و کائنات کا الوہی تصوّر

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۲۱ھ بمطابق ۲۰۰۰ء

انسانیت کا الوہی منشور
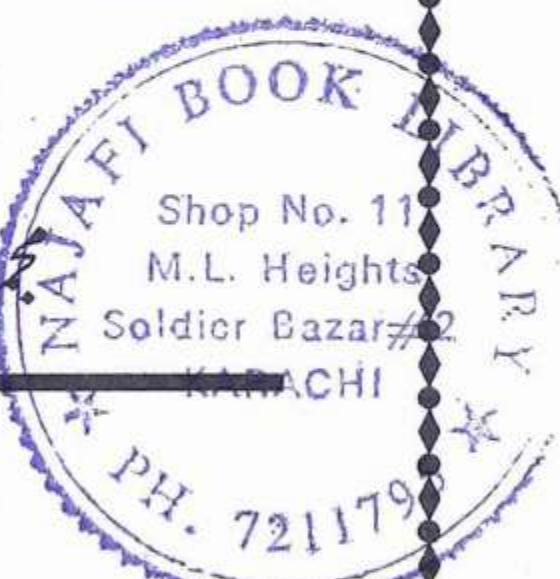
مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۲۲ھ بمطابق ۲۰۰۱ء

اساس آدمیت اور قرآن

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۰۰۲ء

میراثِ عقل اور وحیِ الٰہی

مجموعہ تقاریر عشرہ محرم ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۰۰۳ء

حجۃ الاسلام مولانا عقیل الغروی مدظلہ العالی

زیرِ طبع کتاب

قضا و قدر

مجموعہ تقاریر سال ۲۰۰۵ء